قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا اِکہترواں سال

فروری 2014ء

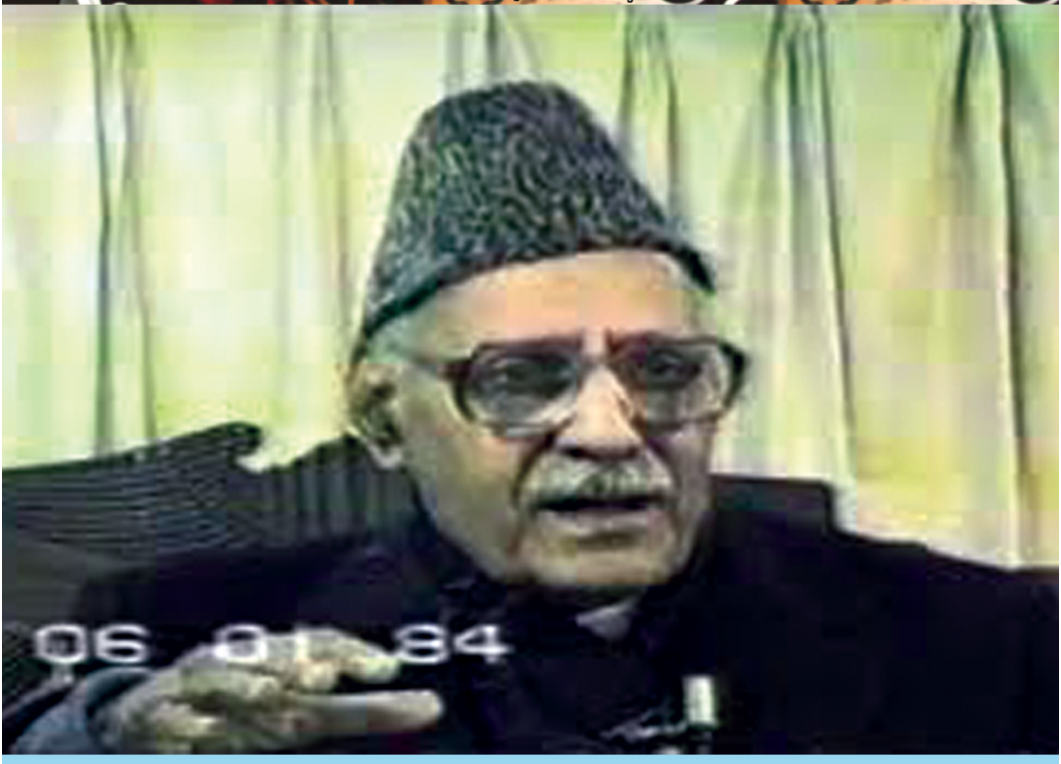
ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

www.toluislam.com

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ



وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

FOUNDED IN 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL NO. 28
VOL.67
ISSUE
2

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546 , 042-35753666 , 042-35764484
E-mail:idara@toluislam.com
web:www.toluislam.com

قرآن اَب بھی سنبھال سکتا ہے

آج دنیا کی حالت اُس سے کہیں زیادہ نازک اور
تشویش انگیز ہو چکی ہے جو زمانہ نزول قرآن کے وقت تھی
لیکن جس طرح قرآن کریم نے انسانیت کو تباہی اور
بربادی کے جہنم میں گرنے سے اُس وقت بچا لیا تھا،
آج بھی اس میں اتنی قوت اور صلاحیت ہے کہ وہ گرتی
ہوئی انسانیت کو سنبھال لے
اور راستے کی پُرخطر گھاٹیوں سے بچا کر اسے
صحیح وسلامت منزلِ مقصود تک پہنچا دے
اور دنیا ایک بار پھر اس عظیم حقیقت کو بے نقاب دیکھ لے
کہ جو قوم قوانین خداوندی کا اتباع کرے گی،
وہ خوف وحزن سے مامون رہے گی۔ (البقرہ:38)

(علامہ پرویزؒ کی کتاب مفہوم القرآن جلد اول صفحہ نمبر 11 سے اقتباس)

جلد 67 شمارہ نمبر 2 فروری 2014ء

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: طریق کار	ادارہ	3
تعارف: غلام احمد پرویز (بٹالہ/لاہور)		17
مذہبی پیشوائیت	ملک منظور حسین لیل	20
اکثریت	کاشف راز	28
نظریۂ ارتقاء	راجہ عبدالعزیز	35
دینی اور دنیوی تعلیم! آج کا تقاضا کیا ہے؟	حسن جعفر	50
مذہب کے نام پر خونریزی کا تدارک...کیوں اور کیسے؟	سلیم صافی	54

ENGLISH SECTION

Surah Al-Muddaththir – Durus-al-Qur'an By G.A.Parwez

Parah 29: Chapter 21 Translated by: Dr. Mansoor Alam 58

دفتر کا پتہ B-25 گلبرگ 2، لاہور۔54660، پاکستان

فون: 042-35714546، 042-35764484

E-mail: idara@toluislam.com

انتظامیہ

ناشر وقائم مقام چیئرمین محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق ۔ ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی

محمد سلیم اختر

قانونی مشیر

ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

زرِتعاون

پاکستان میں 40 روپے فی پرچہ

سالانہ -/450 روپے

بیرون ملک 2500 روپے سالانہ

بینک اکاؤنٹ نمبر

3082-7 نیشنل بینک آف پاکستان، مین مارکیٹ گلبرگ

برانچ کوڈ (0465) ۔ لاہور

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

Naveed Graphic 5.5x8 1c

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

زیرِنظر شمارہ کے لمعات، محترم پرویز صاحب کے رشحاتِ قلم کی نذر ہیں ــــ مندرجہ ذیل خط کے مضمون سے ملتے جلتے خطوط ادارہ کو اب بھی موصول ہوتے ہیں۔ ایسے مراسلات کا جواب آج بھی وہی ہے جو پرویز صاحب نے قریباً چوالیس برس قبل درجِ ذیل مراسلہ کا دیا تھا۔ تبدیلی اور اس کے طریقِ کار پر یہ ایک جامع و مانع تحریر ہے جسے آپ کی نذر کیا جا رہا ہے۔

طریق کار

ذیل کا خط ملاحظہ فرمایئے:۔

مکرمی و محترمی جناب پرویز صاحب!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کی کتاب "ISLAM A CHALLENGE TO RELIGION" پر ''پاکستان ٹائمز'' میں ریویو اور اس کے بعد اس پر ایک خط 25 اکتوبر 1969ء نظر سے گزرا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر سوچنے والے شخص کے سامنے یہی سوال ہے کہ

The only thing which is missing from it is the methodology of bringing into being the "Rububiyat Order" which forms the core of Mr. Parwez's social and political philosophy.

ذہن یہ باور ہی نہیں کرتا کہ آپ جو اتنے عرصے سے اس راہ کے مسافر ہیں، اس کے جواب سے معذور ہوں۔ آپ کے پاس یقیناً اس کا جواب ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ جواب اُس منزل سے پہلے ظاہر کر دیا جائے جس میں وہ جواب عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ آپ کی طرح اس راہ پر چل رہے ہیں اور اس جگہ پہنچ گئے جہاں یہ سوال ان کے ذہن میں بھی پیدا ہو گیا (جیسے راقم الحروف

اوراس کے چند ساتھی)۔ان سے اس جواب کو ''چھپا کر رکھنا'' بھی ایک قسم کا بخل ہے جس کے آپ مرتکب نہیں ہو سکتے۔اس لئے ازراہِ کرم مکمل طور پر یا چند سطور میں بطور خُلّص چند اشارات کی شکل میں راقم الحروف کو لکھ بھیجیں تو بندہ نوازی سے بعید نہیں ہوگا۔اللہ تعالیٰ آپ کو بیش از بیش علم وحکمتِ قرآنی سے نوازے۔ فقط والسلام!

مجھے اس مضمون کے کئی خطوط' کئی ایک دیگر احباب کی طرف سے بھی موصول ہوئے ہیں۔اس بنا پر (نیز مسئلہ کی اہمیت کا بھی یہی تقاضا تھا) میں نے مناسب سمجھا ہے کہ ان احباب کو فرداً فرداً جواب دینے کے بجائے (ماہنامہ) طلوعِ اسلام کی وساطت سے' اس مسئلہ کی وضاحت کر دی جائے۔

میں سب سے پہلے محترم مستفسر کی خدمت میں عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ بات یہ نہیں کہ میں اس اہم سوال کے جواب کو اس منزل سے پہلے ظاہر نہیں کرنا چاہتا جس میں وہ جواب' عمل' میں لایا جا سکتا ہو۔میں نے جس مقصد کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے رکھا ہے' اس میں کوئی راز ایسا نہیں جسے کسی خاص وقت تک کے لئے پوشیدہ رکھنا ضروری ہے — بلکہ یوں کہئے کہ اس میں راز کوئی بھی نہیں۔اس میں تو کیفیت یہ ہے کہ — سخنے نگفتہ را چہ قلندرانہ گفتم ہے — اس قسم کی مصلحت کوشیاں' عملی سیاست کے میدان کے نبرد آزماؤں کے لئے ضروری ہوتی ہیں اور میں نے نہ اس میدان میں قدم رکھا ہے' نہ قدم رکھنے کا ارادہ ہے۔اس لئے ہر چہ گویم قلندرانہ گویم۔**فالحمد للّٰہ علی ذلک!**

جہاں تک میری کتاب پر تبصرہ کے ضمن میں ان ریمارکس کا تعلق ہے جنہیں مندرجہ بالا خط میں دُہرایا گیا ہے' میں (محترم تبصرہ نگار سے معذرت کے ساتھ) جرأتِ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ان کے یہ ریمارکس بے محل تھے۔میری کتاب کا موضوع یہ ہے کہ اسلام' ایک دِین ہے' مذہب نہیں اور جب تک اسے مذاہبِ عالم کے زمرے سے الگ نہیں کیا جاتا' نہ اس کی حقیقت سمجھ میں آ سکتی ہے' نہ اس کا مقصود و منتہیٰ۔کتاب کا بیشتر حصہ' مذہب اور دین کے بنیادی فرق کی وضاحت پر مشتمل ہے۔اس کے بعد' میں نے مثبت طور پر بتایا ہے کہ قرآنِ کریم جس دین' (یعنی نظامِ حیات) کو پیش کرتا ہے' اس کے اصولی خط و خال کیا ہیں اور وہ دیگر نظام ہائے حیات سے کس طرح مختلف اور متمیز ہے۔کتاب کی ساری بحث فکری ہے اور وہ اسلام کا صحیح تصور پیش کرتی ہے۔ظاہر ہے کہ اس قسم کی کتاب کے سلسلہ میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس میں اس نظام کو پاکستان میں عملاً متشکل کرنے یا نافذ کرنے کا طریقہ کیوں نہیں بتایا گیا۔

اس حقیقت سے ہر صاحبِ نظر واقف ہے کہ فکری راہنمائی اور عملی طریق کار دو الگ الگ شعبے ہیں۔میں قرآنِ کریم کا ایک ادنیٰ سا طالب العلم ہوں اور اپنی فکری راہنمائی اسی سرچشمۂ ہدایت سے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔قرآنی راہنمائی زندگی کی مستقل اقدار اور اصولی حدود کی شکل میں ملتی ہے۔یہ اقدار اور حدود غیر متبدل ہیں۔قرآن وہ طریقے متعین نہیں کرتا جن کے مطابق ان اقدار واصول کو ایک نظام یا معاشرہ کے محسوس پیکر میں منتقل کیا جائے گا۔یہ طریقے حالات کے تقاضے کے مطابق' ہر دَور (بلکہ ایک ہی دَور

کے مختلف اوقات) میں مختلف ہوں گے اور عند الضرورت ان میں تغیر و تبدل ہوتا رہے گا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے ان طریقوں کو خود متعین نہیں کیا۔ یہ جو ہمارے ہاں' اسلامی نظام کے سمجھنے میں اس قدر الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں' تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگوں نے' ان طریقوں کو بھی جو کسی زمانے میں' اس وقت کی ضروریات کے مطابق' حصولِ مقصد کے لئے وضع اور اختیار کئے گئے تھے' قرآنی اصول و اقدار کی طرح غیر متبدل اور ابدی سمجھ رکھا ہے۔ وہ طریقے' اب زمانے کے بدلے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے' اور ہمارا قدامت پرست طبقہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی کو خلافِ اسلام قرار دے دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ خود اسلام کے متعلق یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ یہ کسی زمانے میں تو خوشگوار نتائج پیدا کر گیا تھا لیکن اب اس میں زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں' لہٰذا' ہمیں اس کے ساتھ چمٹے نہیں رہنا چاہئے۔ ایک قرآنی مفکر اس قسم کی غلطی نہیں کرتا۔ (یا یوں کہئے کہ اسے ایسی غلطی نہیں کرنی چاہئے)۔ وہ اپنے دَور کے مسائل پر غور کرتا اور ان کے متعلق جو قرآنی راہنمائی ملتی ہے' اسے فکری انداز سے قوم کے سامنے پیش کر دیتا ہے اور طریق کار ان لوگوں کے لئے چھوڑ دیتا ہے جو اس راہنمائی کے مطابق عملی عمارت استوار کرنا چاہیں۔ البتہ وہ اس باب میں اتنی احتیاط ضرور برتتا ہے کہ یہ دیکھے کہ جو عملی طریق اختیار کیا جائے وہ قرآن کے کسی اصول سے نہ ٹکرائے۔

یہ ہے وہ بنیادی حقیقت جسے نظر انداز کر دینے کا نتیجہ وہ اعتراض ہے جسے محترم تبصرہ نگار نے میری کتاب پر بھی وارد کیا ہے اور (دوسرے مقام پر) علامہ اقبالؒ پر بھی۔ ان کے متعلق بھی انہوں نے کہا ہے کہ اقبالؒ نے اپنے آپ کو فکری مباحث تک محدود رکھا اور حصولِ مقصد کے لئے عملی طریق کار تجویز نہ کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اقبالؒ کی دیدہ وری اور دور نگہی تھی جو انہوں نے ایک مفکر کے صحیح مقام اور منصب کو سمجھ لیا اور عملی طریق کار کو اس مردِ سیاستدان کے سپرد کر دیا جس کی فراست اور دیانت پر انہیں اعتماد تھا۔ انہوں نے اپنے کلام میں ایک آدھ مرتبہ عملی طریق تجویز کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اربابِ نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ اس میں وہ اس مقام تک نہ پہنچ سکے جو بہ حیثیت مفکر انہیں حاصل تھا۔ اور اسی لئے انہوں نے پھر اس کی کوشش نہیں کی۔ کلامِ اقبالؒ میں ان کی مثنوی ـــــ پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق ـــــ کو ایک خاص مقام حاصل ہے ـــــ بہت بلند مقام ـــــ اس مثنوی کے نام سے (جو ان کا اپنا تجویز کردہ ہے) واضح ہوتا ہے کہ اس وقت انہوں نے عملی طریق کار کے تعین کی اہمیت کو محسوس کیا تھا لیکن اس باب میں جو کچھ انہوں نے کہا وہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ وہ ان کی آزادانہ فکری تخلیق نہیں تھا' ماحول کے اثرات کا نتیجہ تھا اور اسی لئے اسے چنداں اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔ اُس زمانے میں مسٹر گاندھی کی سودیشی تحریک کا عام چرچا تھا۔ چنانچہ اقبالؒ نے بھی اپنی قوم سے کہا تو یہی کہ

آنچہ از خاکِ تو رُست اے مردِ حُر
آں فروش و آں بپوش و آں بخور
آں نکو بیناں کہ خود را دیدہ اند
خود گلیمِ خویش را بافیدہ اند

(مفہوم: اے آزاد انسان جو کچھ بھی تمہاری سرزمین کی خاک سے پیدا ہوتا ہے اُسی سے بنائی ہوئی اشیائے صرف کو استعمال میں لاؤ۔ یعنی غیر ملکی اشیاء کا بائیکاٹ کرو کیونکہ جو لوگ خود آگاہ ہوتے ہیں وہ اپنی گدڑی خود ہی سیتے ہیں۔ س۔ا)

اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ (اقبالؒ کو اپنا فکری مرشد تسلیم کرنے کے باوجود) قائدِ اعظمؒ کی عملی سیاست کی نگہ نتائج شناس نے طریق کار کے اس مشورہ کو درخورِ اعتناء نہ سمجھا اور نہ اقبالؒ نے اس پر زور دیا ـــــ قائداعظمؒ تو ایک طرف خود مسٹر گاندھی نے دو ہی قدم آگے جا کر اس طریق کو گردِ کارواں کی طرح پیچھے چھوڑ دیا تھا ـــــ حتیٰ کہ اہمسا (عدم تشدد) کو بھی جو اس کے نزدیک اس کے (مذہب) دھرم کا جزو تھا ـــــ عملی سیاست کے تقاضے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

اب آیئے ہم دیکھیں کہ قرآنی نظامِ ربوبیت جب (صدرِ اوّل میں) پہلی بار عملاً متشکل ہوا تھا تو اس کی صورت کیا تھی۔ لیکن اس سے پہلے، چند الفاظ میں اسے سمجھ لیجئے کہ اس نظام کی عمارت کس بنیاد پر استوار ہوئی تھی (اور استوار ہوگی)۔ وہ سنگِ تاسیس یہ تھا کہ

> ہر شخص اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق، مفوضہ امور کو نہایت محنت اور جانفشانی سے سرانجام دے اور اس کے ماحصل میں سے، بقدر اپنی ضرورت کے لے کر، باقی سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیدے۔ بلکہ بعض حالات میں، دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم رکھے اور اس کا نہ کسی سے اجر مانگے نہ معاوضہ۔ حتیٰ کہ کسی کے شکریہ تک کا بھی متمنی نہ ہو۔

یہ تھا اس نظام کا سنگ بنیاد جو اسلام کا مطمحِ نظر تھا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ تصور، نہ صرف اس نظامِ سرمایہ داری کے خلاف تھا جو اس زمانے میں عام تھا، بلکہ انسان کی طبیعی زندگی کے جبلی تقاضا (INSTINCT) کے بھی خلاف۔ انسان کی طبیعی زندگی کا جبلی تقاضا، مفادِ خویش کا تحفظ ہے۔ اسے کسی دوسرے کے مفاد کی کوئی فکر اور پروا نہیں ہوتی۔ اس لئے جو تقاضا، قرآنی نظام کا سنگِ بنیاد قرار پاتا ہے، وہ اسے اس کے جبلی تقاضوں سے بلند لے جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ (حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنے والے) عام انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے خاص انداز کے انسان کی ضرورت ہے۔ اور انسانیت سازی درحقیقت قرآنی تعلیم کا مقصود ہے۔ اسی داخلی انقلاب سے وہ جذبۂ محرکہ پیدا ہوتا ہے جس سے انسان اتنے بڑے ایثار کے لئے بطیبِ خاطر تیار ہوسکتا ہے۔ اس نظام کی تشکیل کے لئے جب نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا آغاز کیا، تو اس وقت (حضورؐ کے سوا) دنیا میں کوئی مسلمان نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے اس نظامِ نَو کے اصول و اقدار اپنی قوم کے سامنے پیش کئے اور پیش کرتے چلے گئے۔ قوم نے اس دعوت کی مخالفت کی لیکن ان میں ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے اس پر سکون و اطمینان سے غور و فکر کیا اور اس کے بعد، جب وہ اس کی صداقت کے متعلق، دل اور دماغ کی

کامل رضامندی سے مطمئن ہوگئے تو انہوں نے اسے قبول کرنے کا اقرار کرلیا۔ اور اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بن گئے جس کی طرف حضور ﷺ دعوت دیتے تھے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ اس زمانے میں وہی لوگ مسلمان کہلاتے تھے جو اپنے قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ اس نظام کی صداقت کے قائل ہو چکے تھے۔

جو لوگ اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بنتے تھے ان کی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام خود نبی اکرم ﷺ فرماتے تھے۔ قرآنِ کریم نے جو حضورؐ کی یہ خصوصیتِ کبریٰ بیان کی ہے کہ یعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم تو وہ اسی حقیقت کی وضاحت کرتی ہے۔ یعنی حضورؐ انہیں اس نظام کے قوانین وضوابط کی تعلیم دیتے تھے۔ اس کی حکمت وغایت سے آگاہ کرتے تھے اور اس طرح ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کرتے چلے جاتے تھے۔ ''صلاحیتوں کی اس نشوونما'' سے مراد صرف ذہنی صلاحیتیں نہیں، اس سے مفہوم ان صلاحیتوں کی نشوارتقاء بھی ہے جن کی بنیادوں پر انسانی سیرت وکردار کی بلند وبالا عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسے انسانی ذات کی نشوونما کہا جاتا ہے۔ اسی سے ابن آدم، حیوانی سطح سے بلند ہوکر انسانی سطح پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہوجاتا ہے اور یہی چیز جذبۂ محرکہ بنتی ہے اس عظیم ایثار کا جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ جب ان میں سیرت وکردار کی اس قسم کی پاکیزگی اور پختگی پیدا ہوجاتی ہے، تو ان سے ایک عہد لیا جاتا ہے جو درحقیقت اسلامی نظامِ ربوبیت کی اساس ہے یعنی یہ عہد کہ

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ (9:111)

یہ حقیقت ہے (یونہی ذہنی عقیدت مندی نہیں) کہ مومنین نے اپنا مال اور اپنی جان خدا کے ہاتھوں فروخت کردیئے ہیں اور خدا نے انہیں جنت کے عوض خرید لیا ہے۔

اسی جماعت کے افراد کو مومن کہا جاتا تھا۔ یعنی وہ لوگ

(1) جنہوں نے سوچ سمجھ اور دیکھ بھال کر، برضا ورغبت، اس نظام کی صداقت کو قبول کیا۔

(2) ان کی تعلیم وتربیت خود رسولؐ اللہ نے فرمائی اور اس طرح ان کے قلب ونگاہ میں قرآنی اقدار کے مطابق انقلاب پیدا ہوتا چلا گیا۔ اور

(3) انہوں نے اپنی جان اور مال اسی نظام کے ہاتھ فروخت کردیا۔

رسولؐ اللہ کی مکی زندگی پوری کی پوری اسی عمل تزمیل[1] (جماعت سازی) میں بسر ہوگئی اور تیرہ سال کے عرصہ میں جو افراد اس سوسائٹی کے ممبر بنے، ان کی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی۔ اگر ہم اپنے اندازوں کے مطابق ماپیں تو یہ پروگرام بڑا سُست خرام دکھائی دے گا۔ آپ غور کیجئے کہ حضورؐ کی عمرِ رسالت صرف تیئیس سال تھی اور آپ کا عہدِ رسالت قیامت تک کے عرصہ کو محیط تھا۔ اس اعتبار سے حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک سانس صدیوں پر بھاری تھا۔ اس تیئیس سال کے گراں بہا عرصہ میں سے تیرہ سال کی مدت ابتدائی

---

[1] رسولؐ اللہ کو اسی جہت سے قرآن میں المزمل کہا گیا ہے یعنی وہ جو رفقائے سفر کے انتخاب میں انتہائی کاوش واحتیاط سے کام لے۔

عملِ تزمیل میں صرف ہوگئی اور اس کا ماحصل چند سو افراد سے آگے نہ بڑھا۔ اور حضورؐ کی طرف سے یہ سب کچھ نہایت سکون و سکوت کے ساتھ ہوا۔ جو حضرات بنیادی نظریات کی تبلیغ و تعلیم کے مرحلہ کو ''بے عملی'' سے تعبیر کرتے ہیں اور عمل کا تصور ان کے ہاں ہنگامہ خیزی اور شورش انگیزی ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک حضورؐ کی یہ تیرہ سالہ زندگی تو ''بے عملی'' کا دَور کہلائے گی!

اس جماعتِ مومنین کی مکی زندگی ایک اور اہم حقیقت کی بھی پردہ کشا ہے۔ لوٹ مار، جنگ و جدال، فتنہ و فساد، عربوں کی گھٹی میں پڑا تھا، اور اس جماعتِ نَو کے افراد انہی عربوں میں سے تھے۔ اس تیرا سال کے عرصہ میں، اس جماعت کے افراد پر ہر قسم کے مظالم ہوئے۔ انہیں نا قابلِ برداشت تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ان میں سے کسی نے نہ کسی قسم کا دنگا فساد کیا، نہ لڑائی جھگڑا، نہ کسی کو لوٹا نہ کھسوٹا، نہ کہیں پتھراؤ کیا نہ گھیراؤ۔ حتیٰ کہ نہ کہیں جھوٹ بولا نہ کسی کو فریب دیا، نہ کسی سے بدمعاملگی کی، نہ کسی قسم کی عہد شکنی۔ تکلیفیں برداشت کرتے رہے، مصیبتیں اٹھاتے رہے۔ لیکن فریق مقابل کے خلاف نہ جھوٹا پراپیگنڈہ کیا، نہ کسی قسم کی غلط بیانی سے کام لیا، نہ کوئی سازش کی، نہ زمین دوز تحریک چلائی۔ جو کچھ کہا کھلے بندوں کہا۔ جو کچھ کیا علی الاعلان کیا۔ اپنے کام سے کام رکھا۔ اور جب دیکھا کہ مکہ کے مقابلہ میں مدینہ کی فضاء اس نظام کے قیام کے لئے زیادہ سازگار ہے تو نہایت خاموشی سے ہجرت کر کے وہاں چلے گئے اور جاتے وقت بھی کسی کو کسی قسم کا دھوکا دیا، نہ خیانت کی۔

مدینہ گئے تو وہاں کسی سے حکومت نہیں چھینی۔ نہ ہی ایسا ہوا کہ کوئی بنی بنائی حکومت کسی نے ان کے حوالے کر دی ہو۔ وہاں انہوں نے اپنی مملکت قائم کی — ''مملکت قائم کی'' کے الفاظ ذرا وضاحت طلب ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ مملکت قائم کس طرح سے کی گئی تھی۔ اس کے لئے طریق کار کیا اختیار کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں قرآن پھر ایک اصول بیان کرتا ہے اور وہ اصول ایسا جامع ہے جس میں تمام تفاصیل خود بخود سمٹ کر آ جاتی ہیں۔ سورۃ النور میں ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (24:55)

یعنی یہ مملکت نہ کسی سے چھین جھپٹ کر لی گئی تھی نہ کسی نے بطور بخشائش ہبہ کر دی تھی۔ یہ فطری نتیجہ تھی ان کے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا — ایمان — یعنی اپنے نصب العین کی صداقت پر یقین محکم۔ اور اعمالِ صالحہ — قرآنی اقدار و اصول کے اندر رہتے ہوئے، موقعہ اور محل کے مطابق مناسب اقدامات۔ (واضح رہے کہ قرآن نے ''اعمالِ صالحہ'' پر اتنا زور دیا ہے لیکن ان اعمال کی کوئی جامع و مانع فہرست مرتب کر کے نہیں دی۔ حتیٰ کہ اس نے ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' کو جماعتِ مومنین اور مملکتِ اسلامیہ کا بنیادی فریضہ قرار دیا ہے لیکن (بجز چند احکام) معروف و منکر کی تفاصیل بھی خود متعین نہیں کیں۔

جب یہ جماعت صاحبِ اقتدار ہوگئی۔ یعنی وسائلِ رزق ان کے قبضہ میں آ گئے تو معاشرہ میں نظامِ ربوبیت خود بخود نافذ ہوگیا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ یہ کاروان، مختلف وادیوں میں سے گزرنے کے بعد، اپنی منزلِ مقصود تک جا پہنچا۔ اُس وقت نہ کسی نے یہ سوال

اُٹھایا کہ مملکت تو مل گئی ہے' اب اس میں کس قسم کا نظام قائم کیا جائے۔ نہ یہ تنازعہ پیدا ہوا کہ فلاں قسم کا معاشی نظام اسلامی ہے یا غیر اسلامی ـــــ انہوں نے چلنے سے پہلے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ ہم نے پہنچنا کہاں ہے۔ اس لئے منزلِ پر پہنچنے کے بعد' کسی کے دل میں یہ سوال نہ اُبھرا کہ یہ ہماری منزلِ مقصود ہے یا نہیں۔ ان میں سے ہر فرد جو اس سوسائٹی کا ممبر بنا تھا' سب کچھ دیکھ بھال' سوچ سمجھ کر' ممبر بنا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو معلوم تھا ـــــ اور حتمی اور یقینی طور پر معلوم' کہ اس سوسائٹی کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہمارا فریضہ کیا۔ یہ افراد' اس سوسائٹی کا ممبر بننے کے بعد' اپنے آپ کو' اُس مقصد کے حصول کے لئے تیار کرنے اور اس کے اہل بننے میں مصروف رہے۔ جب انہوں نے اپنے اندر اس کی اہلیت پیدا کرلی' تو مقصد حاصل ہوگیا۔ یعنی اسلامی نظام قائم ہوگیا۔ اس کے بعد یہ لوگ اس نظام کے استحکام و فروغ اور اندرونی اور بیرونی خطرات سے اس کی حفاظت و مدافعت کے لئے مصروفِ جدوجہد رہے۔ یہ ہے وہ ''طریق''، جس کے مطابق صدرِ اوّل میں یہ نظام قائم ہوا۔ یعنی اس نظام کے اصول و اقدار کو بہ دلائل و براہین دوسروں کے ذہن اور دل نشین کرانا' اور جو اس طرح ان کی صداقت تسلیم کرلیں' مناسب تعلیم و تربیت سے' ان کی انسانی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا' یہی ہے وہ پروگرام جسے میں نے شروع میں انسانیت سازی سے تعبیر کیا ہے۔

☆.....☆.....☆

اب آپ تاریخ کے اوراق کو چودہ سو سال آگے اُلٹ کر' پاکستان کی طرف آجایئے۔ یہاں ایک ایسی قوم بستی ہے جو مسلمان کے نام سے متعارف تو ہے لیکن

(1) ان میں سے نہ کسی نے' اسلام کو سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کر' دل اور دماغ کے کامل اطمینان کے ساتھ' بطیبِ خاطر اختیار کیا ہے۔

(2) نہ ہی ان کے سامنے اسلام کا کوئی واضح اور متعین مفہوم ہے۔

(3) نہ ہی انہیں حتمی طور پر معلوم ہے کہ اسلامی نظام کسے کہتے ہیں اور اس کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے۔ اور جو اسلام ان کے ہاں مروّج ہے' وہ' وہ مذہب ہے جو انفرادی اور گروہی مفادات کے تحفظ کے لئے ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع کیا گیا۔

(4) نہ ہی (صدرِ اوّل کے مسلمانوں کی طرح) ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام ہوا ہے۔

(5) نہ ہی انہوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے' اپنی جان اور مال کو کسی کے ہاتھ فروخت کردینے کا معاہدہ کیا ہے۔ اور

(6) نہ ہی یہ مملکت انہیں' ان کے ایمان و اعمالِ صالح کے نتیجہ میں ملی ہے۔

یہاں حالت یہ ہے کہ:

(1) یہ قوم' متفق علیہ طور پر اتنا بھی نہیں بتاسکتی کہ مسلمان کہتے کسے ہیں۔

(2) کوئی معاملہ پیش آئے۔ ایک گروہ اسے اسلامی قرار دیتا ہے اور دوسرا غیر اسلامی۔ کوئی اسے جائز ٹھہراتا ہے کوئی ناجائز' ذرا ذرا

سی بات پر ان میں باہمی سر پھٹول ہوتی ہے۔ ان کی بیویوں پر طلاق پڑتی ہے' ان پر کفر کے فتوے صادر ہوتے ہیں اور کوئی اتھارٹی ایسی نہیں جسے متنازعہ معاملات میں حکم تسلیم کیا جاتا ہو۔

اور تماشہ یہ کہ کوئی اس باب میں (SERIOUS) نہیں کہ اس راہ گم کردہ قافلہ کے لئے منزل کا تعین اور راستے کی وضاحت کی جائے۔ ایک طرف حکومتیں آتی رہیں اور جاتی رہیں اور ان میں سے ہر ایک کی کوشش یہ رہی کہ مملکت کا نام اسلامی رکھ کر اور آئین میں یہ شق داخل کر کے کہ ملک کا کوئی قانون اسلام (یا کتاب وسنت) کے خلاف نہیں ہوگا' مُلّا سے جان چھڑاؤ اور عوام میں سستی شہرت حاصل کرو۔ دوسری طرف' اربابِ مذہب کی یہ کیفیت کہ اُن میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اسلام کے لفظ کو اپنی مفاد پرستیوں کے لئے سپر بنا رکھا ہے اور کچھ وہ جو ''مذہبی علوم'' سے تو واقف ہیں لیکن اسلام کی حقیقت سے قطعاً نا آشنا ہیں اور نہ خود' جہالت کی تاریکی سے نکلنا چاہتے ہیں' نہ اپنے معتقدین کو نکلنے دینا چاہتے ہیں۔ ان کے بعد ایک گروہ ایسا بھی ہے جو (مذکورہ بالا حالات سے متاثر ہو کر) اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہے کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے' اب یہ ہمارے کسی کام نہیں آ سکتا۔ یہ گروہ دل میں تو اس کا قائل ہے' لیکن معاشرتی دباؤ کے ماتحت اپنے اس عقیدہ کو اعلانیہ زبان تک لانے کی جرأت نہیں کرتا — یہ حضرات' ڈرائنگ رومز میں بیٹھے' گھنٹوں ان خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں اور اس کے بعد اُٹھ کر سیدھے ''داتا صاحب'' پہنچ جاتے ہیں۔

یہ ہے یہاں کی مسلمان قوم اور یہ ہیں اس قوم اور ملک کے حالات! اور اس کے بعد مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ (تم نے قرآن پر غور وفکر کیا ہے) تم بتاؤ کہ (اس قوم میں کسی قسم کی تبدیلی کئے بغیر) یہاں قرآن کا معاشی نظام (نظامِ ربوبیت) کس طرح نافذ کیا جائے؟

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!

اگر کسی نے پوچھنا ہے تو یہ پوچھے کہ (اقبالؔ کے الفاظ میں) اس ''مسلمانے نامسلمانے'' کو ''مسلمان'' کس طرح بنایا جائے تاکہ اس کے بعد یہاں کا معاشرہ' قرآنی معاشرہ میں بدل جائے اور موجودہ غلط معاشی نظام کی جگہ نظامِ ربوبیت آ جائے۔ نظامِ ربوبیت' کوئی خودکار مشین نہیں' جسے کہیں سے امپورٹ کر کے یہاں نصب کر دیا جائے اور سوئچ دبا دینے سے وہ چلنے لگ جائے۔ نظامِ ربوبیت' دل کی گہرائیوں سے اُبھرنے والی اُمنگوں کے محسوس پیکر کا نام ہے اور یہ کسی ایسی قوم میں نفاذ پذیر نہیں ہو سکتا جس کے اعماقِ قلب میں اس قسم کی تبدیلی نہ پیدا ہوئی ہو۔ ہم تو نسلی مسلمان ہیں۔ جو بدوؔ اسلامی مملکت کے قیام کے بعد (دل کی تبدیلی کے بغیر' کسی اور تقاضا سے) حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے تھے' قرآن نے ان کے متعلق کہہ دیا تھا کہ — قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ — یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ قُلْ۔ ان سے کہہ دو۔ لَمْ تُؤْمِنُوْا۔ تم ایمان نہیں لائے۔ اس لئے ایسا مت کہو۔ وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا — تم صرف یہ

کہو کہ ہم اس نظام کے سامنے جھک گئے ہیں۔ اس لئے کہ وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ۔ ایمان ہنوز تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اُترا۔ اس کے بعد، جب تمہاری مناسب تعلیم وتربیت ہوجائے گی اور تم، اپنے دل کی کامل رضامندی سے، اس نظام کی اطاعت کروگے، تو پھر تمہارے اندر وہ تبدیلی پیدا ہوجائے گی جسے ایمان کہہ کر پکارا جاتا ہے (49:14)۔

آگے بڑھنے سے پہلے، میں اس حقیقت کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم مسلمان، اگر قلب ونگاہ کی تبدیلی سے مسلمان نہیں ہوئے، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ میں موجودہ مسلمانوں کی قومی (اجتماعی) زندگی کو بیکار سمجھتا ہوں۔ بالکل نہیں۔ جب کوئی قوم، اقدار (یا آئیڈیالوجی) کے اشتراک کی بنا پر، اپنی اجتماعیت سے محروم ہوجائے لیکن وہ اس کے باوجود انفرادی زندگی کے بجائے اجتماعی زندگی بسر کرنا چاہے، تو اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی وجہِ تعارف کو اپنی اجتماعیت کی بنیاد قرار دے لے اور اس طرح اپنے افراد کو تنکوں کی طرح منتشر ہونے سے بچالے۔ اس قسم کی اجتماعی زندگی، انفرادی زندگی سے بہرحال بہتر ہوتی ہے بشرطیکہ اس سے، دوسروں کے خلاف نفرت کے جذبات اور سلب ونہب کی ہوس نہ اُبھرے۔ میں نے، تقسیم ہند سے پہلے، مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کو برقرار رکھنے اور اسے مستحکم کرنے کے لئے (اپنی بساط کے مطابق) جو کچھ کیا اس کا جذبۂ محرکہ یہ تھا کہ قوم کی اس ہیئت کو بہرحال قائم رکھا جائے تاکہ اس اجتماعیت سے اگر ہمیں ایک آزاد خطۂ زمین حاصل ہوجائے تو اس میں قرآنی نظام کے قیام کا امکان ہو۔ ہندوستان کا ایک جزو رہتے ہوئے اس کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔

اور تقسیم ہند کے بعد، میں نے اس امکان کو مشہود بنانے کے لئے جدوجہد شروع کردی۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ تھا کہ (جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے) اس ''مسلمانِ نامسلمانے'' کو مسلمان بنادیا جائے —— وہ مسلمان جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ

''زباں'' سے کہہ بھی دیا لاالٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں!

میں نے اس کے لئے، سنتِ رسولؐ اللہ کے اتباع میں، طریقہ وہی اختیار کیا جسے حضورؐ نے اپنی دعوت کے آغاز میں اختیار فرمایا تھا۔ یعنی میں نے

(1) سب سے پہلے، اپنی قوم سے کہا کہ ہمارا مروّجہ اسلام، دین نہیں رہا، مذہب میں تبدیل ہوچکا ہے۔ اسے جب تک دین میں تبدیل نہیں کیا جائے گا، مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوں گے۔ میں نے گذشتہ بیس بائیس سال میں جو ہزارہا صفحات لکھے ہیں، تقریریں کی ہیں، درس دیئے ہیں، وہ سب اسی مقصد کے لئے تھے۔ میں نے پہلے دین اور مذہب میں فرق کرکے بتایا اور پھر مثبت طور پر دین کا قرآنی تصور قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس کے ساتھ ہی، جو اہم معاملہ قوم کے سامنے آیا، اس کے متعلق وضاحت سے بتایا کہ

قرآن اس باب میں کیا راہنمائی دیتا ہے۔

(2) میں نے اربابِ بست وکشاد اور اصحابِ فکر ونظر سے کہا کہ موجودہ مسلمانوں سے (جیسے کچھ بھی ہیں) مملکتِ پاکستان کو محفوظ رکھنے اور مستحکم بنانے کا کام لیا جائے، لیکن ہماری نئی نسلوں کی تعلیم وتربیت کا ایسا انتظام کیا جائے جس سے ان کے قلب ونگاہ میں وہ تبدیلی پیدا ہوجائے جسے ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ ہوگی وہ قوم جسے صحیح معنوں میں ''ملتِ اسلامیہ'' کہہ کر پکارا جائے۔ اس ملت کے وجود میں آجانے سے اسلامی معاشرہ وجود میں آجائے گا اور انہی کے قلوب سے ابھرنے والی امنگوں سے نظامِ ربوبیت قائم ہوگا۔ اس کے لئے عملی طریق کیا اختیار کیا جائے گا، اسے، وہ ملت، اس وقت کے حالات کے مطابق، خود طے کرلے گی۔

یہ ہے اسلامی نظام قائم کرنے کا وہ طریقہ جسے میں اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق سمجھ سکا ہوں اور جسے منہاجِ رسالت پر تدبر وتفکر کے بعد میں نے (اپنی استعداد کے مطابق) اختیار کر رکھا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ حضورؐ نے تبلیغ دین کے ساتھ، ایک الگ جماعت (اُمت) کی تشکیل بھی فرمائی تھی اور میں نے الگ جماعت سازی سے سخت اجتناب کیا ہے اور اپنے آپ کو صرف ایک مبلغ کی حیثیت تک محدود رکھا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ایک رسولؐ، اپنے پیغام کے نہ ماننے والوں کو کافر قرار دیتا ہے اور جو لوگ اس پیغام کی صداقت کو قبول کرلیتے ہیں انہیں، ان کو کفار سے الگ کرکے، ایک متمیز اُمت کی تشکیل کرتا ہے۔ لیکن میں تو پوری کی پوری اُمتِ محمدیہ کو، دنیا کے جملہ غیر مسلموں (کفار) کے مقابلہ میں، ایک جماعت سمجھتا ہوں، اس لئے اس امت کے اندر، کافر ومسلم کی تفریق کا تصور بھی میرے نزدیک معصیتِ کبریٰ اور جرمِ عظیم ہے۔ امتِ محمدیہ کے اندر کافر ومسلم کی تفریق تو ایک طرف، قرآنِ کریم، اس امت کے اندر فرقہ بندی کو بھی شرک قرار دیتا ہے (30:31)۔ اور رسولؐ اللہ سے کہتا ہے کہ ایسا کرنے والوں کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں رہے گا (6:160)۔ اس لئے میں ایک الگ جماعت بنانے کی جرأت کیسے کرسکتا ہوں۔ میں دین کے متعلق قرآنی تصورات کو عام کئے جارہا ہوں اور جو لوگ ان تصورات سے متفق ہوجاتے ہیں، ان سے کہتا ہوں کہ وہ بھی اسی طرح انہیں عام کرتے جائیں تاکہ ہماری پوری قوم کے سامنے دین کے صحیح تصورات آجائیں۔ اسی طرح جب میں، قوم کی نئی نسل کے لئے قرآنی تعلیم وتربیت پر زور دیتا ہوں اور اب (بالآخر) خود ایک درسگاہ قائم کرنے کی تجویز کو آگے بڑھا رہا ہوں، (افسوس کہ درس گاہ کا خواب کبھی پورا نہ ہوسکا۔ س۔ا) تو یہ بھی پوری قوم کے بچوں کے لئے کر رہا ہوں، کسی خاص گروہ یا پارٹی یا کسی خاص طبقہ کے بچوں کے لئے نہیں۔ میرا منصب مسلمانوں کے سامنے اس دین کا صحیح تصور لانا ہے جس کی طرف نسبت سے وہ (اور ہم) اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ جب ان کے سامنے دین کا تصور آجائے گا اور ان کے دل ودماغ میں قرآنی تبدیلی پیدا ہوجائے گی، تو وہ، موجودہ غیر اسلامی نظامِ زندگی کو قرآنی نظام میں بدلنے

کے لئے طریق کار خود تجویز کرلیں گے۔ یہ ہے میرا مشن۔

من از طریق نہ پرسم، رفیق می جویم
کہ گفتہ اند، نخستیں رفیق باز طریق!

(مفہوم: میں راہ نہیں پوچھتا، میں تو ہم راہ ڈھونڈ رہا ہوں ضرب المثل ہے کہ پہلے رفیق پھر طریق! س۔ا)

اس سلسلہ میں مجھ سے اکثر کہا جاتا ہے کہ جس منزل کی تم نے نشاندہی کی ہے، اس سے تو ہم متفق ہیں لیکن اس تک پہنچنے کے لئے جو راستہ تم تجویز کرتے ہو وہ بہت لمبا ہے اور زمانہ آج بڑی برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس لئے یہ تو ـــــ تا تریاق از عراق آوردہ شود، مار گزیدہ مردہ شود ـــــ والا معاملہ ہے۔ اس کے لئے کوئی (SHORT-CUT) ہونا چاہئے۔

یہ اعتراض (بظاہر) بڑا وزنی دکھائی دیتا ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ اکثر عجلت پسند طبائع اس سے متأثر بھی ہو جاتی ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ قرآنِ کریم (یا اسوۂ رسولؐ اللہ) سے مجھے کوئی (SHORT CUT) ملتا نہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے، قرآن کے تجویز کردہ راستے کی لمبائی اور رفتار کی (بظاہر) سُستی کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی گراں قدر عمرِ رسالت کا قریب ساٹھ فیصد حصہ، مکی زندگی کے تبلیغی مرحلہ میں گزرا اور اس کا ماحصل چند سو نفوس سے زیادہ دنیا کے سامنے نہ آیا۔ اس کے بعد مدنی زندگی کا ابتدائی دَور بھی، مخالفتوں کے ہجوم کے مقابلہ اور مدافعت میں گزرا۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اس محنتِ شاقہ سے کاشت کردہ کھیتی کو اپنے سامنے برومند ہوتا دیکھنے کی آرزُو خود حضورؐ کے دل میں بھی بیدار ہوتی لیکن بارگاہِ خداوندی سے جواب ملتا کہ اِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (13:40)۔ ''جو کچھ ان لوگوں سے کہا جاتا ہے اگر اس کا کچھ حصہ تیری زندگی میں سامنے آجائے یا تو اس سے قبل ہی وفات پا جائے، تو اس سے تیرے پروگرام پر کچھ اثر نہیں پڑنا چاہئے۔ تیرا کام یہ ہے کہ تو اس پیغام کو لوگوں تک پہنچائے چلا جا۔ یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے قانونِ مکافات کی رُو سے اس کے محسوس نتائج کب سامنے آتے ہیں''۔ آپ نے غور فرمایا کہ داعیٔ انقلاب کی اس معصوم و حسین آرزو کے باوجود، کوئی چھوٹا متبادل راستہ تجویز نہیں کر دیا گیا۔ ''تبلیغ'' کا وہی طول طویل پروگرام برقرار رکھا گیا اور اسی پر مستقل مزاجی سے عمل پیرا رہنے کی تاکید کی گئی۔ جب راستے کی طوالت کو حضور رسالت مآبؐ کے لئے بھی مختصر نہیں کیا گیا تو ہم آپ کس قطار شمار میں ہیں۔ خدا کے مقرر کردہ قوانین اٹل ہیں اور ان میں کسی کی خاطر بھی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا، ہمارے لئے دو ہی راستے ہیں۔ اگر ہم نے قرآن کی متعین کردہ منزل تک پہنچنا ہے ـــــ یعنی اپنے ہاں قرآنی نظامِ

ربوبیت نافذ کرنا ہے تو اس کے لئے پروگرام بھی وہی اختیار کرنا ہوگا جسے قرآن نے تجویز کیا ہے۔ یعنی قلب ونگاہ کی تبدیلی سے ''مسلمانِ نامسلمانے'' کو مسلمان بنانا' تاکہ وہ نظام اس کے ایمان واعمالِ صالح کے فطری نتیجہ کے طور پر متشکل ہو سکے۔ اس راستے کو قرآن نے العقبۃ سے تعبیر کیا ہے یعنی پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنا ـــــ پہاڑ کی گھاٹی پر تیز قدمی سے چڑھا جا ہی نہیں سکتا۔

ویسے اگر کوئی ہنگامی طور پر قرآن کے معاشی نظام کو یہاں نافذ کرنا چاہتا ہے' تو اسے حکومت قانوناً نافذ کر سکتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مفاد پرست گروہ اسے جبر سے تعبیر کرے گا لیکن قانوناً اسے جبر نہیں کہا جا سکے گا۔ اس لئے کہ جب مسلمان' قرآن پر ایمان رکھنے کا اقرار کرتے ہیں تو قرآن کے کسی حکم کی اطاعت کو وہ جبر کس طرح کہہ سکتے ہیں؟ لیکن یہ محض ایک ہنگامی اور وقتی تدبیر ہوگی۔ اسے نہ دوام وثبات حاصل ہو سکے گا اور نہ ہی دیانت دارانہ طور پر عمل ہوگا۔ دیانتدارانہ عمل اسی قانون پر ہو سکتا ہے جس کا تقاضا انسان کے دل سے اُبھرے۔ خارج سے وارد کردہ قوانین کی اطاعت طوعاً وکرہاً ہی کی جاتی ہے اور جن لوگوں کے مفاد پر اس سے زد پڑتی ہو' وہ ہر وقت اس سے گریز کی راہیں تلاش کرنے یا تراشنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اسے دوام وثبات اسی صورت میں حاصل ہو سکے گا جب یہ اس قوم کے ہاتھوں متشکل ہو جس کے قلب ودماغ میں وہ تبدیلی آ چکی ہو جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ اس کا بھی انتظام رکھے کہ ان آنے والی نسلوں کی ذہنیت بھی قرآنی سانچوں میں ڈھلتی رہے (جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں) قرآنی نظامِ ربوبیت کی بنیادی اینٹ یہ ہے کہ

> ہر شخص اپنی صلاحیتوں کے مطابق' مفوضہ کام کو پوری پوری محنت سے سرانجام دے اور اس کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لے کر باقی سب دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دے۔ بلکہ ہنگامی اوقات میں' دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضرورت پر ترجیح دے۔

آپ سوچئے کہ ایسا نظام جس کا سنگِ تاسیس یہ ہو' قلب ونگاہ کی تبدیلی کے بغیر کسی صورت میں قائم ودائم رہ سکتا ہے اور قلب ودماغ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے کے لئے تو یقیناً وقت لگے گا اور اس مدت کو ہمیں ہمت اور حوصلہ سے برداشت کرنا پڑے گا۔

لیکن اگر ہم اتنے لمبے وقت کا انتظار نہیں کر سکتے' تو پھر ہمیں قرآنی منزل کو اپنے سامنے رکھنا ہی نہیں چاہئے۔ سیدھے طور پر اپنی منزل آپ متعین کر لینی چاہئے اور اس تک پہنچنے کے راستے بھی خود ہی تجویز کر لینے چاہئیں۔ لیکن پھر دیانتداری کا تقاضا ہے کہ ہم اس پر اسلام کا لیبل نہ لگائیں۔ میں نے ملک کے ذمہ دار حضرات سے شروع ہی میں کہا تھا کہ جب وہ اسلام' اسلام پکارتے ہیں تو انہیں چاہئے کہ پہلے اچھی طرح سمجھ لیں کہ اس سے مراد کیا ہے۔ اس کے بعد وہ فیصلہ کریں کہ کیا اسلام کو نظامِ حیات بنانے کی ہم میں ہمت ہے۔ اگر ہے تو پھر کسی قسم کی مخالفت کی پروا کئے بغیر' اس راستے پر گامزن ہو جائیے۔ لیکن اگر وہ سمجھیں کہ اس قسم کے نظام کا قیام ان کے

بس کی بات نہیں، تو وہ کھلے بندوں اس کا اقرار کر کے، دیگر اقوامِ عالم کی طرح اپنے ہاں سیکولر نظام رائج کر لیں۔ اس سے وہ اگر مقامِ مومن تک نہیں پہنچ سکیں گے تو انہیں کم از کم مقامِ آدمیت تو نصیب ہو جائے گا۔ لیکن انہیں، نہ اس نظام کے قیام کی ہمت ہوئی نہ اس اقرار کی جرأت۔ نتیجہ اس کا وہ منافقت ہے جو اب قوم کے بیشتر حصہ کا شعار بن چکی ہے اور جس سے ہم جہنم کے ''اسفل'' میں پہنچ چکے ہیں۔

شباشب انقلاب لانے کے متمنی حضرات ذرا اتنا سوچیں کہ ہمارے پیشِ نظر تو قرآنی انقلاب ہے جو مظہر ہوتا ہے افرادِ قوم کے قلبی اور ذہنی انقلاب کا۔ اگر ہم ان تحریکوں کی تاریخ پر بھی غور کریں جو معاشرہ کی کسی ایک شق میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے وجود میں آئی تھیں تو ہم دیکھیں گے کہ انہیں ابھی اپنے نظریات کی تبلیغ اور ان کے مطابق ذہنیتوں میں تبدیلی کے لئے سالہا سال (بلکہ بعض اوقات صدیوں تک) کا عرصہ لگ گیا اور اس کے بعد جا کر کہیں ذرا سی تبدیلی ہو سکی۔ سطح بین نگاہیں ان تحریکوں کا مشاہدہ اس وقت کرتی ہیں جب وہ نظری انقلاب کی طول طویل مسافت طے کر چکنے کے بعد، ظہورِ نتائج کے مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہیں، اس لئے وہ سمجھتی ہیں کہ انقلاب شباشب آ جاتا ہے۔ یہ ان کی نگاہ کی بھول ہوتی ہے۔ انہیں کیا علم کہ قطرے کو گہر ہونے تک کس کس قسم کے ''حلقۂ صد کامِ نہنگ'' سے گزرنا پڑتا ہے۔

ایک جلنے کے سوا اور کوئی کیا جانے
حالتیں کتنی گزر جاتی ہیں پروانے پر

ان تحریکوں کی نقالی کرنے والے بھی، اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور وہ تحریک کی صدیوں پر پھیلی ہوئی نہایت صبر آزما اور ہمت طلب لیکن خاموش و پرسکوت مسافت سے صرفِ نظر کر کے، آغازِ کار اس مرحلہ سے کر دیتے ہیں جہاں اس تحریک کی نمود محسوس پیکروں میں ہوئی تھی۔ نتیجہ اس کا انقلاب نہیں فساد ہوتا ہے — یعنی تخریب بلاتعمیر!

قرآن، مستقل اقدار کی رُو سے انقلاب کا پیامبر ہے اور فساد کو بدترین جرم قرار دیتا ہے اور اس قسم کے انقلاب کے لئے وہ دل اور دماغ دونوں کے انقلاب کو شرطِ لاینفک قرار دیتا ہے خواہ اس میں کتنا ہی وقت کیوں نہ لگ جائے۔

اور قرآن کے اسی انقلاب کا میں مبلغ ہوں اور اس کے لئے اُسی کے تجویز کردہ راستہ پر گامزن — جو احباب مجھ سے کسی اور طریق کے متقاضی اور متمنی ہیں، میں ان کی خدمت میں اس سے زیادہ اور کیا عرض کر سکتا ہوں کہ

زما نگاہ طلب، کیمیا چہ می جوئی!

(مفہوم: تُو مُجھ سے دیکھنے والی نگاہ حاصل کر۔ کیمیا گری کے نسخے کیوں تلاش کرتا ہے۔ س۔ا)

بعض احباب کہتے ہیں کہ جس منزل کی تم نے نشاندہی کی ہے، وہ بھی درست ہے اور اس تک پہنچنے کا جو طریق تم تجویز کرتے ہو ہمیں اس سے بھی اتفاق ہے، لیکن تم نے اپنا مخاطب تعلیم یافتہ (INTELLECTUALS) عوام کا طبقہ قرار دے رکھا ہے حالانکہ موجودہ غلط معاشرہ میں سب سے بری حالت عوام کی ہے، اس لئے تمہیں چاہئے کہ عوام (MASSES) میں جا کر اپنے پیغام کی تبلیغ کرو۔ انقلاب عوام کے لانے سے آئے گا۔

میں اس وقت اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ قرآنی انقلاب عوام کے لانے سے آتا ہے یا اربابِ فکر و نظر کے قلب و دماغ میں تبدیلی پیدا کرنے سے۔ میں ان حضرات سے، جو سمجھتے ہیں کہ اصل کام کرنے کا میدان عوام کا طبقہ ہے، عرض کروں گا کہ جب بات آپ کے سامنے اس قدر واضح طور پر آ چکی ہے تو پھر آپ اُٹھ کر اس کے مطابق کام کیوں نہیں کرتے؟ آپ مجھ سے تقاضا کیوں کرتے ہیں کہ میں اپنا اختیار کردہ پروگرام ترک کر کے، اس پروگرام کو اختیار کروں جسے آپ بہتر قرار دیتے ہیں۔ ایک مامور من اللہ (رسول) کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی دوسرا کسی متبادل راستے کو اختیار نہیں کر سکتا لیکن میں تو نہ مامور من اللہ ہوں اور نہ ہی میں نے اس انقلاب آفرینی کا اجارہ لے رکھا ہے۔ میں نے بطیب خاطر، اپنے لئے زندگی کا ایک مشن تجویز کر رکھا ہے اور اسی پر میں گامزن ہوں۔ جو احباب میرے اس مشن کے ساتھ اتفاق کر کے میرے رفیق سفر بنتے ہیں، میں ان کی رفاقت کو شکریہ کے ساتھ قبول کرتا ہوں، جنہیں اس سے اختلاف ہوتا ہے، ان سے بصد معذرت عرض کر دیتا ہوں کہ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں اور اپنے لئے جو نسا راستہ بہتر خیال کریں اسے اختیار کر لیں۔ اب آپ سوچئے کہ جو حضرات اس کے باوجود یہ اعتراض کئے جائیں کہ تم ہمارا تجویز کردہ راستہ کیوں اختیار نہیں کرتے، میں انہیں کیا جواب دوں۔ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ اس قسم کے اعتراضات وہی لوگ کرتے ہیں جو خود کوئی تعمیری کام نہیں کر سکتے اور دوسروں کی تنقیص و تنکیر سے اپنے آپ کو اس خود فریبی میں مبتلا رکھتے ہیں کہ ہم بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں۔ کام کرنے والا اگر کسی راستے کو غلط سمجھتا ہے تو اسے چھوڑ کر کسی دوسرے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتا کہ خود ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے اور دوسروں کے پروگرام میں نقص نکال کر عمر بھر یہ شکایت کرتا رہے کہ وہ اس کے تجویز کردہ راستے کو کیوں اختیار نہیں کرتے۔

یہ ہے میرا مسلک، جس پر میں کاربند چلا آ رہا ہوں اور کاربند رہنا چاہتا ہوں کیونکہ میں اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق اسی کو صحیح سمجھتا ہوں۔

والسلام!

پرویز

☆.....☆.....☆

تعارف: غلام احمد پرویز

بٹالہ/لاہور

(بشکریہ تحریک پاکستان گولڈ میڈل 1989ء

مطبوعہ شعبہ تحریک پاکستان، محکمہ اطلاعات وثقافت، حکومت پنجاب)

علامہ غلام احمد پرویز مرحوم کی تاریخ پیدائش 9/جولائی 1903ء ہے۔ تحریک پاکستان کے دوران مرکزی حکومت ہند کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ قیام پاکستان کے ساتھ ہی وہ مرکزی حکومت پاکستان میں منتقل ہو گئے اور 1955ء میں اسسٹنٹ سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

شیدائی ءاقبالؒ ہونے کے ناطے آپ 1930ء سے مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت کے اس تصور کو آگے بڑھاتے رہے جسے حضرت علامہ اقبالؒ نے الٰہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اپنے صدارتی خطبہ میں پیش کیا تھا۔

1937ء کے موسم گرما میں، علامہ اقبالؒ کے ایماء پر حضرت قائداعظمؒ نے اپنے قیامِ شملہ کے دوران علامہ پرویز کو بلا کر فرمایا کہ یہ مولوی صاحبان تحریک پاکستان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، اس کی مدافعت کے محاذ کو میں تمھارے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ حضرت قائداعظمؒ کی ہدایت پر وہ تمام ضروری اقدامات کئے گئے جن کے نتیجہ کے طور پر ماہنامہ ''طلوع اسلام'' کے دور جدید کا اجراء، مئی 1938ء کے شمارے کے ساتھ عمل میں آیا۔ اس ماہنامہ میں پرویز صاحب نے قرآن کریم کے عطا فرمودہ ''دوقومی نظریہ'' اسلامی مملکت کی ضرورت اور اس کے بنیادی تقاضوں پر گرانقدر مقالات لکھے۔ اس دوران کانگرسی اور نیشنلسٹ علماء کی طرف سے مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت کے خلاف جو کچھ لکھا جاتا رہا، اس کا آپ نے موثر دفاع کیا۔

علامہ موصوف اس وقت سرکاری ملازمت میں تھے، اس لئے مسلم لیگ کے سٹیج سے بات کرنا تو ان کے لئے دشوار تھا تاہم دہلی اور اس کے گردونواح کے ایسے تمام شہروں میں جہاں شام کو جا کر اگلے روز علی الصبح واپس آیا جا سکے، مسلم لیگ کے شبانہ جلسوں کے فوراً بعد اسی سٹیج سے بزمِ اقبال کی محفل آراستہ کی جاتی جس میں پرویز صاحب قرآن کریم اور فکر اقبالؒ کی روشنی میں تحریک پاکستان اور مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے تصور کو واضح طور پر قوم کے سامنے پیش کرتے۔

یہ عملی جدوجہد قیام پاکستان تک جاری رہی۔ حتیٰ کہ جب 1946ء میں سرخ پوشوں اور کانگرس کی ملی بھگت سے مسلم اکثریت کے صوبہ سرحد میں، پاکستان میں شمولیت/عدم شمولیت کے سوال پر ریفرنڈم کرانا طے پایا گیا تو پرویز صاحب صوبہ سرحد میں تشریف لے گئے اور اس وقت کے سرحد مسلم لیگ کے صوبائی صدر خان بخت جمال خان اور ان کے رفقاء کی معاونت سے صوبہ کی

کانگرسی وزارت اور سرخپوش لیڈر خان عبدالغفار خان کو ہمہ جہت مخالفتوں کے علی الرغم سرحد کے مسلم عوام کا فیصلہ کن ووٹ پاکستان کے حق میں ڈلوانے میں کامیاب ہوئے۔

علامہ پرویز 38-1937ء سے حضرت قائداعظم علیہ الرحمتہ کے تحریک پاکستان کی دینی اساس کے موضوع پر ذاتی مشیر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ یہی وہ واحد شخصیت تھی جنہیں حضرت قائداعظمؒ سے پیشگی وقت لئے بغیر ان کی خدمت میں، کسی وقت بھی باریابی کا شرف حاصل رہا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ قائداعظمؒ نے قرآنی ہدایات سامنے آجانے کے بعد ہمیشہ انہی کے مطابق عمل کیا۔ پرویز صاحب ان معدودے چند دانشوروں میں شامل ہیں جنہوں نے بقول پیر علی محمد راشدی، پاکستان کی سکیم کی تیاری میں مدد کی تھی۔

حضرت قائداعظمؒ علامہ پرویز پر غایت اعتماد رکھتے تھے اور ان کی رائے کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ جب اس کا وقت آیا تو ان سے پاکستان کے سیکرٹریٹ کے لئے مناسب افسروں کے انتخاب کے لئے سفارش طلب کی۔

قیام پاکستان کے بعد اپنی وفات تک جب کسی دریدہ دہن نے بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ یا ان کے رفقاء کے خلاف ہرزہ سرائی کی ناپاک کوشش کی تو یہی مردمجاہد آڑے آیا اور ہر موقع پر ایسے مدلل مقالات سپرد قلم کئے جن سے تحریک پاکستان کے ان زعماء کی عظمت کردار نکھر اور ابھر کر قوم کے سامنے آتی رہی۔

علامہ غلام احمد پرویز نے 24 فروری 1985ء کو وفات پائی۔

☆.....☆.....☆

ENJOY YOUR STAY AT
HOTEL PARKWAY (PVT.) LTD.
NEAR RAILWAY STATION LAHORE



ALL COMFORTS AVAILABLE

- T.V. & FAX
- AIR-CONDITIONED
- TELEPHONE EXCHANGE
- CAR PARKING
- LIFT, INTERNET
- EXCELLENT SERVICE

PH:0092-42-36365908-12, FAX: 0092-42-36311923,
E-mail:hotel_parkway@yahoo.com

بیادِ غلام احمد پرویزؔ

عبدالعزیز خالدؔ

ہو گیا رخصت بساطِ تنگنائے دہر سے
اک خدا آگاہ، روشن فکر، مردِ خود گرے

دانش و بینش کا پیکر، پُر بہار و خوش صفات
کلک و قرطاس و لبِ اظہار جس کی کائنات

اک ادارہ، ایک تحریک، اک مشن تھی جس کی ذات
شمع رکھی جس نے روشن فکرِ قرآنی کی تاحینِ حیات

طعنے گمراہی کے سنتا، وار بدنامی کے جو سہتا رہا
بات اپنے دل کی بیباکی سے لیکن برملا کہتا رہا

مہر خاموشی لگی خوفِ فسادِ خلق سے
جس کے ہونٹوں پر نہ پل بھر کے لئے

(کیوں نہ ہو جدت پسندی کو اِبا تقلید سے
کیا دماغ نکتہ پرور کور مغزوں سے ڈرے؟)

جہل فتوے جس کے کفر و قتل کے دیتا رہا
کشتیِ عمرِ رواں جو بحرِ ہیبت ناک میں کھیتا رہا

قرض مرگِ ناگہاں سے روز جو نقدِ نفس لیتا رہا

زندگی بھر تنگ ظرفی سے کیا جس نے نباہ
اک زمانہ جس کے عزم و استقامت کا گواہ

بے گناہی کے سوا کیا تھا بھلا اس کا گناہ؟
تھی بقولِ محرماں اس کو نہ حرصِ مال و جاہ

باوجودِ بے نوائی بے محابا، بے پناہ
کچھ نہ رکھتا تھا وہ اقبالی قلندر

جُز دو حرفِ لا اِلٰہ

کوہکنؔ کی جس میں پامردی، یہ وہ پرویز تھا
اور اسی باعث تھی شیرینؔ خرد اس پر فدا

صاحبِ فرہنگ، اندیشہ سگالے، عاقلے
کہتے تھے جس کے عقیدت مند ''بابا جی'' اُسے

وہ وفاداری بشرطِ استواری کی مثال
عمر بھر کی بے قراری کا ثمر جس کا کمال

تھے بہم جس میں مذاقِ منطق و ذوقِ جمال
آگہی کی اِک فروزاں شمع تھی جو بجھ گئی

آہ بیدردی تری! اے زندگی! اے زندگی!

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

مذہبی پیشوائیت
احبار و رُہبان

(گزشتہ سے پیوستہ)

مذہبی پیشوائیت کی پُرکاری:۔ طلوعِ اسلام مئی ۱۹۸۴ء۔ص۔۴۳:۔ ''اقبالؒ نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ ملوکیت اور سرمایہ داری کا نظام مذہبی پیشواؤں کی خدا فریبیوں کے بل بوتے پر قائم ہوتا ہے۔ جابر حکمران اور خون آشام سرمایہ دار، غریبوں اور کمزوروں کو کچلتے چلے جاتے ہیں، اور مذہبی راہنما انہیں تھپکیاں دے دے کر سُلاتے رہتے ہیں کہ یہ سب خدا کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ حکومت اور دولت خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں وہ جسے چاہے امیر بنادے اور جسے چاہے فقیر کردے۔ خدا کی مرضی کے خلاف لب کشائی کرنا تو ایک طرف، دل میں بھی اس کے خلاف احساسِ شکایت پیدا نہیں ہونا چاہیئے۔ انسان کو راضی برضا رہنا چاہیئے۔ ان حاکموں اور سرمایہ داروں کو اس دنیا میں یہ کچھ مل رہا ہے۔ تمہیں آخرت میں جنت عطا ہوگی۔ وہ اپنے اس قسم کے سحر کار وعظوں اور سامراتی نصیحتوں سے غریبوں اور مظلوموں کو افیون پلاتے رہتے ہیں۔ مستبد نظامِ ملوکیت اور خون آشام نظامِ سرمایہ داری کو مٹانے کے لئے ضروری ہے کہ مذہبی پیشوائیت کو ختم کیا جائے۔ اس لئے فرشتوں کے نام فرمانِ خداوندی میں کہا گیا:۔

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے　　پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے ہٹادو
''حق را بسجودے صنماں را بطوافے''　　بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھادو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے　　میرے لئے مٹی کا حرم، اور بنادو

آپ پیغامِ اقبالؒ کو شروع سے آخر تک دیکھ جایئے، وہ آمریت اور سرمایہ داری کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کو بھی انسانیت کے لئے باعثِ عذاب قرار دیتا ہے۔ وہ امت کی تباہی کے اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:۔ ع:۔

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر　　سود خوار و والی و ملا و پیر

دوسرے مقام پر کہا ہے کہ:۔ ع:۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری اے کشتہ ء سلطانی و ملائی و پیری

اصل یہ ہے کہ ملوکیت کا استبداد اور سرمایہ داری کا استحصال پنپتا ہی مذہبی پیشوائیت کی مقدس سحر کاریوں کے بل بوتے پر ہے۔''

اربابِ مذہب کی فریب دہی (تبلیغِ مقدر پرستی):۔ طلوعِ اسلام دسمبر ۱۹۷۷ء۔ص۔۴۰:۔ ''عقل کی گرفت انسان کے دماغ پر ہوتی ہے، دل پر نہیں۔ اور دماغ پر گرفت کے ڈھیلا پڑ جانے کا ہر وقت خطرہ ہوتا ہے۔ اس قسم (سرمایہ داری) کے انسانیت کُش نظام، تنہا عقل کے زور پر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتے۔ اس کے لئے انسانی جذبات کو اپنے قابو میں رکھنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ خدمت ''مذہب'' سرانجام دیتا ہے۔ (یاد رکھیئے! میری مراد خدا کی طرف سے عطا کردہ ''دین'' سے نہیں، انسانوں کے خودساختہ ''مذہب'' سے ہے)۔ مذہب کبھی اس زیردست طبقہ کے دل میں یہ عقیدہ راسخ کرتا ہے کہ ہر انسان کی پیدائش اس کے سابقہ جنم کے اعمال کے مطابق ہوتی ہے۔ اس اصول کے مطابق برہمن، برہما کے سر سے پیدا ہوتا ہے، کھشتری اس کے بازوؤں سے، ویش اس کے پیٹ کی اور شودر اس کے پاؤں کی تخلیق ہوتا ہے۔ یہ تقسیم خود برہما کی قائم کردہ ہے جس میں کوئی انسان ردوبدل نہیں کر سکتا۔ اس تقسیم کے خلاف حرفِ شکایت لب تک لانا تو ایک طرف، دل میں شکوہ سنج ہونا بھی انسان کو مہاپاپی بنا دیتا ہے۔ اس لئے انسان کو اپنے مقام پر صابر و شاکر رہنا چاہیئے۔ کبھی وہ اس مظلوم و مقہور طبقہ کو اس فریب میں مبتلا کر دیتا ہے کہ دنیا اور اس کی آسائشیں وہ دلدل ہیں جن میں پھنس کر انسانی روح کبھی خدا سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ تمام لذائذ و حظائظ قابلِ نفرت ہیں۔ دولت مند لوگ اس دنیا کی چند روزہ زندگی، آسائشوں میں گزر الیں۔ اس کے بعد، یہ جہنم کی آگ میں جھلسائے جائیں گے اور آسمان کی بادشاہت غریبوں کے حصے میں آئے گی۔ کبھی وہ انہیں اس عقیدہ میں مگن رکھتے ہیں کہ امیری اور غریبی، عزت اور ذلت، پستی اور بلندی، رزق کی تنگی اور فراوانی، سب خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے اور اسے ہر شخص کی پیدائش سے پہلے مقدر کر دیا جاتا ہے۔ مقدر کا بدل دینا کسی کے بس کی بات نہیں۔ انسان کو ہمیشہ راضی برضا رہنا چاہیئے۔ مرضی ءمولیٰ بر ہمہ اولیٰ۔ اس لئے تقدیر کے خلاف کسی کے لب پر حرفِ شکایت نہیں آنا چاہیئے۔ آپ غور کیجئے تو تقدیر کا عقیدہ ہندوؤں کے ورنوں کے عقیدہ سے بھی زیادہ غیر منطقی ہے۔ ورنوں کا عقیدہ خودساختہ ہی سہی، لیکن اس کے لئے ایک منطقی دلیل تو دی جاتی ہے۔ یعنی اس میں شودر سے یہ کہا جاتا ہے کہ تم جو اس پستی کی حالت میں پیدا کئے گئے ہو، تو یہ ایشور کی دھاندلی نہیں۔ تم نے پچھلے جنم میں کرم ہی ایسے کئے تھے جن کے نتیجہ میں تم شودر پیدا ہوئے ہو۔ لیکن تقدیر کے لئے اتنی سی دلیل بھی نہیں دی جاتی، نہ دی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے کہا یہ جاتا ہے کہ خدا قادرِ مطلق ہے وہ جسے جس حالت میں چاہے رکھے۔ غریبی اور امیری، رزق کی بست و کشاد، پستی اور بلندی، سب اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اس کے لئے (معاذ اللہ) نہ کوئی قاعدہ ہے، نہ قانون۔ یہ یکسر اس کی مرضی پر موقوف ہے۔ اس کے فیصلوں کے خلاف لب کشائی کرنا انسان کو جہنم رسید کر دیتا ہے۔ یعنی اس میں انسانی سوچ اور فکر کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں رہنے دی جاتی۔۔۔ یہ ہیں مکڑی کے وہ جالے جن میں مذہبی پیشوائیت، غریب

انسانوں کو پھنسائے رکھتی ہے۔۔۔۔۔۔۔وہ یہ کرتے ہیں اور سرمایہ دار طبقہ ان کے لئے جاگیریں مقرر کرتا اور جائیدادیں وقف کر دیتا ہے۔ چنانچہ، محنت کر کے نہ یہ کھاتے ہیں نہ ہی ان کا سرپرست طبقہ۔۔۔جھونپڑیوں میں بسنے والا محنت کش اپنا خون پسینہ ایک کر کے ان سب کے محلات کی رنگینیوں کا سامان فراہم کرتا ہے۔ انہی کی محنت کی کمائی سے سرمایہ دار کے پاس فاضلہ دولت کے انبار لگ جاتے ہیں۔ اور مذہب کا مقدس اجارہ دار آگے بڑھ کر یہ فتویٰ دے دیتا ہے کہ تم گھبراؤ نہیں۔ جس قدر جی چاہے دولت اکٹھی کرتے اور جائیدادیں کھڑی کرتے جاؤ۔ تمہیں ایسا کرنے کی کھلی چھٹی ہے۔ وہ اس قسم کے فتووں سے بالادست طبقہ کو کھلی چھٹی دے دیتا ہے کہ دولت خدا کی دین ہے۔ وہ جس قدر جی چاہے سمیٹتے چلے جائیں۔ گویا دولت آسمان سے اولوں کی طرح برستی ہے جسے بچے جھولیاں بھر بھر کر سمیٹ سکتے ہیں۔ انہیں کون بتائے کہ دولت، محنت سے پیدا ہوتی ہے اور وہ ایک روپیہ جسے مترفین کا طبقہ بلا محنت اپنی تجوری میں ڈالتا ہے، مزدور کے سینکڑوں قطراتِ خون کا منجمد فشُردہ ہوتا ہے۔ کیا یہ مقامِ حیرت نہیں کہ یہ لوگ جانوروں کے خون کو تو حرام سمجھتے ہیں، لیکن انسانوں کے خون کو شیرِ مادر کی طرح حلال وطیب قرار دیتے ہیں۔''

☆.....☆.....☆

دورِ ملوکیت:۔ طلوعِ اسلام نومبر ۱۹۸۴ء ص۔۱۹:۔ ''نورانیت کا دور (عہدِ رسالتمآب ﷺ والذین معہٗ) جلد ختم ہو گیا اور اس کی جگہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت نے علم وعقل کی شمعیں گل کر کے، فکرِ انسانی کو تاریکی کی چادروں میں لپیٹ دیا۔ قرآن کریم نے سرکش، مستبد، حدود فراموش اربابِ اقتدار (طاغوت) کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ:۔ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ (2:257)۔ قرآن نوعِ انسان کو تاریکیوں (ظلمات) سے روشنی (نور) کی طرف لاتا ہے۔ ملوکیت انہیں نور سے ظلمات کی طرف لے جاتی ہے۔ لہٰذا، جس طرح چمگادڑ سورج کی روشنی کو برداشت نہیں کر سکتا، اسی طرح سلاطین علم وعقل کی روشنی سے آنکھیں چراتے ہیں۔ علم وعقل ''کیوں'' پوچھتے ہیں۔ اور قوت کے بل بوتے پر اقتدار پر قبضہ کرنے والوں کے پاس ''کیوں'' کا جواب نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ کوشش کرتے ہیں کہ ''کیوں'' پوچھنے والوں کو ختم کر دیا جائے اور قوم میں ''کیوں'' پوچھنے کی استعداد کو سلب کر لیا جائے۔ یہ فریضہ مذہبی پیشوائیت سرانجام دیتی ہے۔ دورِ ملوکیت کے آغاز میں جب اعتراض کیا گیا کہ ایک انسان کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ محض قوت کے زور پر باقی انسانوں کو اپنا غلام بنائے، تو مذہبی پیشوائیت نے انہیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ حکومت خدا کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے (السلطان ظل اللہ علی الارض) ان کے حقِ حکومت پر معترض ہونا منشائے خداوندی کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے۔ یہ کفر ہے۔ الحاد ہے۔ ارتداد ہے۔ ان کی کوئی بات تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے، جب یہ خدا کا فیصلہ ہے تو اس میں انسانی عقل کا کیا دخل ہو سکتا ہے؟۔ ابتداء میں تو انہوں نے اس ''ڈانٹ'' سے کام لیا، اور جب اس پر دو چار پشتیں گزر گئیں تو پھر انہوں نے (عہدِ جاہلیت کے اس) ڈھلے ڈھلائے جواب کو پشت و پناہ بنا لیا کہ:۔ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ (43:22)۔ ہم نے اپنے اسلاف کو جس راستے پر چلتے دیکھا ہے ہم اسی راستے پر چلتے جائیں گے۔ اسلاف کی راہ حق وصداقت کی راہ ہے۔ یوں ملوکیت جیسا

یکسر خلافِ قرآن نظام عین مطابقِ اسلام قرار دیا گیا۔ اس نے قرآن کو پس پشت ڈالنے کے ساتھ عقل و بصیرت کے چراغوں کو بھی گل کر دیا۔ اور قوم، صمٌ، بکمٌ، عمیٌ۔ گونگی بہری، اندھی بھیڑوں کا گلہ بن کر رہ گئی۔ ملوکیت نے مذہبی پیشوائیت کی تائید حاصل کرنے کے لئے ان کے ساتھ بٹوارا کر لیا تھا۔ امورِ مملکت اپنے قبضہ میں رکھے اور امورِ شریعت مذہبی پیشواؤں کی تحویل میں دے دیئے۔''

مذہبی پیشوائیت اور ملوکیت کا گٹھ جوڑ:۔ طلوعِ اسلام اگست ۱۹۸۲ء صفحہ نمبر ۳۷:۔ ''ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا گٹھ جوڑ کیسا ہوتا ہے، اور ان خدائی فوجداروں کے پیشِ نظر مقاصد کیا ہوتے ہیں، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ آتے تو ہیں اپنے مذہب کی حقانیت اور فوقیت ثابت کرنے کے لئے، لیکن بادشاہ سے پہلے معاملہ طے کرتے ہیں کہ ہم اگر کامیاب ہو گئے تو ہمیں کیا ملے گا؟۔ اور بادشاہ انہیں یہ لالچ دیتا ہے کہ ان کا شمار بادشاہ کے مقربین میں ہو جائے گا۔ دوسری طرف ان لوگوں (فرعون کے درباری مذہبی پیشواؤں) کی منافقت کا یہ عالم تھا کہ قرآن کریم کے بیان کے مطابق، وہ دل سے اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے کہ موسیٰ کا دعویٰ حق و صداقت پر مبنی ہے لیکن ان کا پندارِ نفس انہیں اس حقیقت کے اعتراف کی طرف آنے نہیں دیتا تھا (۱۴/۲۷)۔ لیکن ان میں کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی تھے جنہوں نے اس اعتراف کی جراءت کر لی اور اعلان کر دیا کہ موسیٰ کا دعویٰ سچا ہے۔ اس پر جس طرح فرعون گرجا اور برسا ہے، قرآن کریم نے مختلف مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن (بغرضِ اختصار) اس سلسلہ میں صرف ایک نکتہ کو سامنے لایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ فرعون نے ان سے کہا کہ: اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ..... (20:71)۔ ''تم نے میری اجازت کے بغیر ہی اپنے عقیدہ میں تبدیلی کر لی۔ اب دیکھو میں تمہارے کس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر کے تمہیں صلیب پر لٹکاتا ہوں۔'' اس سے ظاہر ہے کہ استبدادِ ملوکیت، آزادیٔ خیال و عقائد کی اجازت نہیں دیتا۔ اس میں تبدیلیٔ عقیدہ (ارتداد) کی سزا موت ہوتی ہے۔۔۔ یہ تھا ملوکیت کے استبداد اور مذہبی پیشوائیت کی دسیسہ کاریوں کا گٹھ جوڑ۔''

ملوکیت کے حق میں قصیدے:۔ طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۸۴ء۔ ص۔ ۷:۔ ''اسلام میں سب سے پہلا مارشل لاء حضرت صدیق اکبرؓ نے لگایا تھا۔'' (ہفت روزہ ''حرمت'' ۱۱ تا ۱۷ نومبر ۱۹۸۳ء)۔ یہ بہت بڑا ''انکشاف'' ہے جو مولانا (محمد مالک کاندھلوی) صاحب نے فرمایا ہے۔ تاریخ اسی طرح مسخ ہوا کرتی ہے۔ ہمارے دورِ ملوکیت میں ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ امام یوسفؒ نے اذان میں یہ اضافہ تجویز کیا تھا کہ:۔ ''ھذا وقت الصلوٰۃ یا امیر المومنین۔'' (بحوالہ۔ ہدایہ۔ باب الاذان)۔ اور (اغلباً) شرح نخبۃ الفکر میں ہے کہ ایک دفعہ خلیفہ ہارون الرشید کبوتر اڑا رہا تھا۔ قاضی یحییٰ بن اکثم نے دیکھا تو فرمایا کہ، رسول اللہ ﷺ بھی کبوتر اڑایا کرتے تھے۔ سچ کہا تھا اقبال نے کہ۔ صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام۔ (یہ الگ بات ہے کہ اس وقت کے خلیفہ نے اذان کے اضافہ کو منع کر دیا تھا۔ اور اپنے کبوتروں کو ذبح)۔''

طلوعِ اسلام نومبر ۱۹۸۴ء۔ ص۔ ۲۸:۔ ''الیافعی نے اپنی تاریخ میں یزید بن عبدالملک کے عہد کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ۔:۔ چالیس

شیوخ نے آکر گواہی دی کہ خلفاء قیامت کے دن بغیر حساب کتاب بخشے جائیں گے۔'' (تاریخ الیافعی۔ص۔۲۳۴)۔۔۔مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔۔۔انہی دنوں محدثین کا ایک بڑا طبقہ پیدا ہوگیا تھا جس نے اس عقیدہ کو اپنا دین بنالیا تھا۔۔۔چنانچہ ابوبکر حصاص اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:۔ان لوگوں کا اس کے ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ ظلم و جور اور بے گناہ لوگوں کے قتل وغیرہ کا صدور بادشاہِ وقت سے اگر ہو تو اس کے خلاف آواز بلند کرنا شرعاً صحیح نہیں (احکام القرآن۔جلد دوم۔ص۔۴۳۔۔۔حصاص۔بحوالہ امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی از مولانا گیلانی مرحوم)۔امام حصاص حنفی تھے اور فقہ حنفی میں یہ فتویٰ اب بھی موجود ہے کہ:۔سربراہِ مملکت، جس کے اوپر کوئی اور صاحب اقتدار نہ ہو، جرمِ قتل کے سوا کوئی جرم بھی کرے، اس پر حد نافذ نہیں ہو سکے گی (ہدایہ۔اولین۔مجیدی۔ص۔۴۹۲)۔''

طلوعِ اسلام فروری ۱۹۷۲ء۔ص۔۲۲۔۲۱:۔''مجھے قوی امید ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت کا جو سلسلہ حضرت علیؓ کی شہادت سے منقطع ہوا تھا اس کی بحالی کا آغاز انشاء اللہ حضرت علیؓ ہی کے عاشقوں میں سے ایک شخص کے ہاتھوں پاکستان کی سرزمین سے ہوگا۔میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ یحییٰ خان صاحب کو عزم و ہمت اور اس اخلاص کے ساتھ پاکستان میں اسلامی جمہوری نظام بحال کرنے کی توفیق عطا فرمائے جس کا انہوں نے بار بار اپنی تقریر میں ذکر فرمایا ہے۔آمین!۔'' (بیان میاں طفیل محمد۔امیر جماعت اسلامی۔بابت یحییٰ خان۔بحوالہ ایشیاء۔۱۴دسمبر ۱۹۶۹ء۔ص۔۸)۔

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی یہ کس کافر ادا کا غمزہء خوں ریز ہے ساقی

طلوعِ اسلام دسمبر ۱۹۸۳ء۔ص۔۳۲:۔''ہزار شکر کہ دیکھے ہیں پھر بہار کے دن۔۔۔صدرِ مملکت جنرل ضیاء الحق نے عید میلاد النبی ﷺ کے روز چند اہم اسلامی احکام و قوانین کے نفاذ کا اعلان کیا ہے۔۔وہ ان بے شمار نعمتوں اور مدحیہ تقریروں سے زیادہ قیمتی ہے جو رسول اکرم ﷺ کی شان میں کی اور کہی گئی ہیں۔۔اس لئے کہ حضور ﷺ کی محبت کا اصل تقاضا تو آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کو قائم کرنا اور آپ ﷺ کے دیئے ہوئے احکام کو نافذ کرنا ہے۔جس کی نہایت مبارک اور قابلِ تحسین ابتداء صدرِ پاکستان کے اس اعلان سے ہوئی ہے۔۔یہ پاکستان کی بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ اپنے جس مقصدِ وجود سے وہ ۳۲ سال محروم رہا اب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہ اس کی راہ پر گامزن ہو رہا ہے۔۔تمام مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس رب کریم کے شکر گزار ہوں اور اس نعمت کی ناقدری کر کے اس کی رحمت کی بجائے لعنت کے مستحق نہ بنیں۔اجرائے احکامِ اسلامی کا اعلان ہو جانے کے بعد صدرِ مملکت، ان کی حکومت اور عدلیہ کے حکام اور عام مسلمان سب بڑی آزمائش میں پڑ گئے ہیں۔انسانی احکام کی خلاف ورزی کرنا اور چیز ہے اور خدا اور رسول ﷺ کے قانون کو توڑنا بالکل ہی دوسری چیز ہے۔اس سے تو آدمی کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے اور وہ خدا کے غضب کا مستحق بن جاتا ہے۔۔ضرورت ہے کہ ہر شخص اپنے دائرہء عمل میں اس عظیم ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کرے، اور سب سے زیادہ حکومت کے لئے

لازم ہے کہ وہ اپنے افسروں اور ملازمین کو تمام ممکن وسائل سے کام لے کر، اس ذمہ داری سے عہدہ برآء ہونے کے قابل بنانے کی کوشش کرے (بیان مولانا مودودی بابت حدود آرڈی ننس۔ بحوالہ ہفت روزہ۔ ایشیاء۔ ۱۱فروری ۱۹۷۹ء)۔ ''مارشل لاء اسلام کی ضد ہے۔ مارشل لاء کے ذریعے اسلام نافذ نہیں کیا جا سکتا (بیان جانشین مولانا مودودی۔ جناب پروفیسر غفور احمد۔ بحوالہ۔ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ۔ ۸۔ نومبر ۱۹۸۳ء)۔''

روزنامہ ''آواز'' لاہور۔ مورخہ۔ ۲۷ دسمبر ۲۰۱۰ء:۔ ''مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کے سربراہ پروفیسر ساجد میر نے کہا ہے کہ شاہ عبدالعزیز کا طرزِ حکومت اسلامی حکمرانوں کے لئے مشعلِ راہ ہے۔'' وہ سعودی عرب کے دارالحکومت ''ریاض'' میں ڈاکٹر یوسف بن عثمان الحزیم کی کتاب ''شاہ عبدالعزیز بن سعود کی قیادت وسیاست کے پندرہ (۱۵) راہنما اصول'' کی تقریبِ رونمائی سے خطاب فرمانے کے بعد علماء کے وفود سے گفتگو کر رہے تھے۔ تقریب سے دیگر حضرات کے علاوہ سعودیہ میں پاکستان کے سفیر عمر خان علی شیرزئی نے بھی خطاب کیا۔'' یہ ہے مذہبی پیشوائیت کا دینِ خوشامد!!!۔

مذہبی پیشوائیت کی محکومی:۔ طلوعِ اسلام جولائی ۱۹۸۴ء۔ ص۔ ۴۲:۔ ملوکیت کی غلامی کے بارے میں لکھنے کے بعد پرویز صاحب، مذہبی پیشوائیت کی زنجیروں کی طرف آتے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔ ''یہ تو تھا ملوکیت کا استبداد جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے سامنے جھکنے پر مجبور کرتا ہے۔ لیکن یہ جھکنا انسان کے بدن کا تھا۔ وہ چاہتا تو اپنے قلب ودماغ کو اس سے آزاد رکھ سکتا تھا۔ لیکن اس سے آگے انسان کے جھکنے کا وہ مقام آتا ہے جس میں اس کا قلب ودماغ محکومیت، اور بڑی شدید محکومیت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ یہ محکومیت تھی مذہبی پیشوائیت کی، جو دوسرے انسانوں سے اپنی خدائی منواتی تھی۔ خواہ یہ ''رضوان فروش'' شریعت کے علمبرداروں کی طرف سے ہو، اور خواہ ''جنت بداماں'' طریقت کے مدعیوں کی طرف سے۔ قرآن نے، غلط عقیدت مندی کے عنکبوتی جالوں میں جکڑے ہوئے انسان کو آواز دی اور اس سے کہا کہ آؤ! میں تمہیں بتاؤں کہ یہ جو مقدس نقابوں کی اوٹ میں خدا کے نمائندے بن کر تمہارے سامنے آتے ہیں، ان کی حقیقت کیا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ (9:34)۔ پیرانِ طریقت ہوں یا علمائے شریعت، ان کا سارا مسئلہ معاشی ہے لیکن یہ اسے مذہب کے نقاب میں چھپائے رکھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کا یہ عالم ہے کہ خود کچھ نہیں کماتے اور دوسروں کی کمائی پر عیش کرتے ہیں۔ دعویٰ ان کا یہ ہے کہ یہ لوگوں کو خدا کی راہ بتاتے ہیں۔ لیکن درحقیقت انہیں خدا کے راستے پر چلنے سے روکتے ہیں۔ ان کا وجود اس کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوتا ہے۔ یہ خدا سے ورے، خود خدا بن بیٹھتے ہیں۔ (انداد من دون اللہ)۔ اس لئے خدا تک پہنچنے ہی نہیں دیتے۔ راستے ہی میں روک لیتے ہیں۔ یہ رہبر نہیں رہزن ہیں۔ یہ اس لئے کہ اگر لوگ ''خدا تک پہنچ جائیں'' (یعنی اس کی کتاب کو اپنا راہنما بنالیں) تو ان ''خدا کے نمائندوں'' کا وجود ہی ختم ہو جائے۔ ان کی خدائی کی حقیقت تو اتنی ہے کہ:۔ ع:۔

ایں خدا تا سجدہ اش کردی خدا است چوں یکے اندر قیام آئی فنا است

(جب تک تو اس کے سامنے سجدہ کئے رکھے گا، یہ خدا ہوگا۔ جونہی تو اٹھ کر کھڑا ہو جائے گا، یہ فنا ہو جائے گا)۔

زندہ بدست مردہ:۔ مذہبی پیشوائیت کی حکمرانی کا دائرہ زندہ انسانوں تک ہی محدود نہیں ہوتا۔ ان کی حکومت ان کے مرنے کے بعد بھی قائم رہتی ہے۔ بلکہ مرنے کے بعد ان کی گرہیں اور زیادہ مضبوط ہو جاتی ہیں۔ ''روحانیت'' کی دنیا میں، زندہ انسانوں پر مردے حکومت کرتے ہیں۔ یہاں مردہ بدست زندہ نہیں ہوتا، زندہ بدست مردہ ہوتا ہے۔ زندہ انسان، ان مردوں کی بے پناہ قوتوں کے خیال سے کانپتا ہے۔ ڈرتا ہے۔ ان کے حضور منتیں مانتا اور نذرانے گزارتا ہے۔ اگر اس کے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی ایسا خیال گزر جائے جسے زیر زمین ''حضرت صاحب'' کی شانِ اقدس میں گستاخی پر محمول کیا جا سکے تو اس پر دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ اور جب تک ان سے معافی مانگ کر، انہیں راضی نہیں کر لیتا (اور یہ معافی، ان کے مجاوروں کے حضور نذرانے گزارے بغیر نہیں مل سکتی) اس وقت تک وہ اطمینان کا سانس نہیں لیتا۔ یہ گزرے ہوئے احبار و رھبان، بزرگوں کے مزاروں کی شکل میں بھی زندہ و پائندہ ہوتے ہیں اور ائمہء سلف کے اقوال و افعال کی صورت میں بھی ہر وقت اعصاب پر سوار۔ ان دونوں کی غلامی کا قلادہ، زندہ انسانوں کی گردن میں پڑا رہتا ہے۔ (اس سے ''تقلید'' کے معنی آپ کی سمجھ میں آ جائیں گے۔ قلادہ اس پٹے یا رسے کو کہتے ہیں جو جانور کے گلے میں ڈال دیا جاتا ہے تاکہ اس کا مالک جدھر جی چاہے اسے، اس سے پکڑ کر کھینچتا پھرے۔ اور وہ خاموش گردن جھکائے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہے)۔ ان کی ''ہمہ وقت موجودگی'' کا یہ عالم ہے کہ خدا کی کتاب کا ارشاد کچھ ہو، آپ کی عقل و بصیرت کچھ کہے۔ جونہی آپ نے ان کی کسی بات کے خلاف کچھ کہا، ان میں سے کوئی نہ کوئی متوفی آپ کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اب آپ آگے بڑھ ہی نہیں سکتے۔۔۔ یہ تھی غلامی کی وہ شدید ترین شکل جس میں انسانیت جکڑی چلی آ رہی تھی۔ قرآن کریم نے ایک انقلابی آواز سے، غلامی کی ان زنجیروں کو تارِ عنکبوت کی طرح جھٹک کر الگ کر دیا۔ اس نے کہا کہ ان کے گزرے ہوئے اسلاف کی پوزیشن اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ: تلک امۃ قد خلت۔۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اپنے وقت پر دنیا سے چلے گئے۔ لھا ما کسبت ولکم ما کسبتم۔۔ جو کچھ انہوں نے کیا اس کی ذمہ داری ان پر ہے۔ اور وہی اپنے اعمال کے نتائج بھگتیں گے۔ جو کچھ تم کرو گے اس کی ذمہ داری تم پر عائد ہوگی۔؛ **وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (2:141)۔ تم سے یہ پوچھا ہی نہیں جائے گا کہ انہوں نے کس قسم کے کام کئے تھے۔ ان میں جو لوگ صاحبِ ایمان تھے ان کے متعلق بھی زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہو کہ: **لِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ** (59:10)۔ وہ ہمارے بھائی تھے جو ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ نہ ان کا کوئی قول تمہارے لئے سند ہو سکتا ہے، نہ ان کا کوئی عمل تمہارے لئے حجت۔ سند اور حجت خدا کی کتاب ہے اور بس۔ اسلاف پرستی سے انسان کا ماضی تو روشن ہوتا ہے لیکن مستقبل تاریک۔''

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

جنوری 2014ء سے

ماہنامہ طلوعِ اسلام کی قیمت =/40 روپے فی پرچہ کی جارہی ہے

براہِ کرم سن 2014ء میں قارئین مندرجہ ذیل حساب سے قیمت ادا فرمائیں

اندرون ملک فی پرچہ =/40روپے سالانہ =/450روپے

بیرون ملک سالانہ -/2500روپے

ہماری کوشش رہتی ہے کہ طلوع اسلام کو خوب سے خوب تر کیا جائے جس کا اندازہ آپ کو بھی ہوگا۔ 2014ء میں ہمارے زیادہ تر مضامین کے مخاطب نوجوان ہوں گے اس لیے سن 2014ء کا سال ہم نوجوانوں کے نام منسوب کررہے ہیں۔

طلوع اسلام ایک تحریک ہے اور قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر بھی، ''تم اللہ کے لیے اکیلے اکیلے اور دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ پھر سوچو (34:46)''، اس ہدایت کی روشنی میں ہم اپنے قارئین دوستوں سے یہ کہنا چاہیں گے کہ وہ ہر ماہ ''طلوع اسلام'' کے 2 رسالے ضرور خریدیں۔ ایک اپنے لیے اور دوسرا اپنے کسی دوست یا عزیز کے لیے۔ طلوع اسلام چندہ وغیرہ مانگنے کا قائل نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق کہ نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو، آپ کا کم از کم تعاون اتنا ہوگا کہ آپ کو دو رسالے خریدنے ہوں گے۔ آپ کے اس تعاون کی وجہ سے ہمارے لیے ممکن ہوگا کہ فروری 2014ء سے ہم تعلیمی اداروں، پبلک لائبریریز اور ریڈنگ رومز کو کم از کم دو شمارے اعزازی طور پر یعنی کوئی قیمت لیے بغیر ہر ماہ دیا کریں۔ اس کام میں ہمارے ساتھ تعاون کیجیے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

ادارہ طلوعِ اسلام

بنک اکاؤنٹ کی تفصیلات درجِ ذیل ہیں:

بنک اکاؤنٹ نمبر 7-3082 نیشنل بنک آف پاکستان، مین مارکیٹ، گلبرگ برانچ کوڈ (0465)۔ لاہور

کاشف راز

اکثریت

MAJORITY

آج کل آپ پاکستان کی سیاست میں جمہوریت کے بارے میں بہت کچھ سن اور پڑھ رہے ہیں مثلاً یہ کہ جمہوریت ہی تمام معاشرتی اور معاشی مسائل کا حل ہے، بہترین ڈکٹیٹرشپ سے بدترین جمہوریت بہتر ہے، ملکی استحکام کے لیے جمہوریت کو اپنانا ہوگا جو فیصلہ جمہور یعنی عوام کرتی ہے وہی بہترین فیصلہ ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ قرآن مجید کی رہنمائی میں ہم آپ کے لیے وہ آیات لکھ رہے ہیں جن کو پڑھ کر آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ اکثریت کے فیصلے کس طرح کے ہو سکتے ہیں۔

اس مضمون میں ہم آپ کی توجہ دو انتہائی اہم باتوں پر چاہتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سب انسانوں کو آزاد اور بااختیار پیدا کیا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے جیسا کہ مذاہب عالم میں آپ دیکھتے ہیں کہ اوپر والا جس کو چاہے ہدایت دے دے اور جس کو چاہے دھتکار دے۔

اللہ اپنے بندوں کو گمراہ کرنا نہیں چاہتا۔ آگے چل کر جن آیات کے مضمون آپ پڑھیں گے وہ اپنی وضاحت آپ ہیں۔ انسانوں کے پاس قرآن کی صورت میں واضح ہدایات موجود ہیں اس کے باوجود انسانوں کی اکثریت کیا کرتی ہے وہ آپ ان آیات میں پڑھیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے انداز بیان کی بہت ساری خوبیوں میں سے ایک بہت بڑی خوبی بقول اللہ تعالیٰ کے یہ ہے کہ ''ہم نے یہ کتاب، قرآن سمجھنے کے لئے بہت آسان کر دی ہے''۔ (54:17,22) ہماری کوشش بھی یہی ہے کہ آسان آسان سی زبان میں بات کی جائے، مشکل زبان کا استعمال کم سے کم کیا جائے، اس کا فیصلہ پڑھنے والے ہی کر سکتے ہیں کہ ہم کس حد تک اپنی بات یا قرآن کی آیات ان تک صحیح طریقے سے پہنچانے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔

انسانوں کی آزادی اور اختیار کے حوالے سے ان آیات کو پڑھئے۔ اور یہ بات ذہن میں رکھتے ہوئے پڑھئے کہ انسان کو آزاد پیدا کیا گیا ہے، جو چاہے راستہ اختیار کر لے۔ ہمارا مقصد یہی ہے کہ ہم آپ کے سامنے قرآن کے حقائق لے آئیں تاکہ آپ کو زندگی میں آنے والے معاملات کا صحیح فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔

اب آپ ان آیات پر توجہ فرمائیے اور دیکھئے کہ عوام کی اکثریت کیا کرتی ہے۔ ہم آپ سے یہ کہتے آرہے ہیں کہ قرآن پڑھئے اور ساتھ ساتھ اپنے معاشرے اور اپنے لوگوں کا جائزہ بھی لیتے جائیے، قرآن جو حقائق ہمیں سمجھانا چاہتا ہے وہ بالکل واضح اور محسوس شکل

میں ہمارے سامنے ہوتے ہیں، ہم لوگ قرآن کی روشنی میں عام طور پر فکر کرنے اور سوچنے کے عادی نہیں ہیں اس لئے اکثریت کیسے اور کس کس طرح کے کام کرتی ہے ان پر ہماری نظر نہیں جاتی۔ ہم ایک ہی بات کہا کرتے ہیں کہ جتنی طاقت ہم غلط کاموں میں صرف کرتے ہیں اسی توانائی کو صحیح کاموں میں خرچ کرنا چاہئے، ان کاموں میں جس کے لئے اللہ نے ہمیں احکام دیئے ہیں۔

توجہ فرمائیے اور سوچئے کہ اکثریت کیا کرتی ہے

1۔ ظالموں کے لئے کئی طرح کے عذاب ہیں لیکن ظالموں میں سے اکثریت اس بات کا علم نہیں رکھتی۔ (52:47)

2۔ قرآن عربی، اس قوم کے لئے ہے جو علم رکھتی ہو لیکن اکثریت نے منہ پھیر لیا اور وہ سنتے ہی نہیں۔ (41:1-4)

3۔ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔ (44:38-39)

4۔ اور ہم نے قرآن میں سب باتیں طرح طرح سے بیان کر دی ہیں مگر اکثر انسانوں نے اس قرآن کو قبول نہیں کیا اور انکار کر دیا۔ (17:89)

5۔ اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے سمجھانے کے لئے طرح طرح کی مثالیں بیان کی ہیں۔ لیکن انسان اکثر جھگڑے کرتا رہتا ہے (کیونکہ قرآن کی تعلیم کے بغیر انسان ہے ہی جھگڑالو) (18:54)

6۔ اور ہم نے اس (قرآن کی آیات) کو طرح طرح سے بیان کیا تاکہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں اور زندگی کے معاملات میں اس کو بطور ذکر نصیحت MEMORANDUM یادداشت، ہر وقت اپنے سامنے رکھیں مگر اکثر انسانوں نے انکار کیا اور قبول نہ کیا۔ (25:50)

7۔ کیا ابھی تک مومنوں کے لئے اس کا وقت نہیں آیا کہ اللہ کی یاد (ذکر اللہ) کرنے کے وقت اور قرآن جو حق کے ساتھ نازل ہوا ہے اس کو سنتے وقت ان کے دل نرم ہو جائیں اور وہ ذکر اللہ یعنی اللہ کی نصیحت پر عمل کریں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں کہ جن کو ان سے پہلے کتابیں دی گئی تھیں کہ جب ان پر ایک لمبا عرصہ گزر گیا تو ان کے دل سخت ہو گئے اور (آج) ان کی اکثریت (MAJORITY) فاسقون ہیں۔ (57:16)

(یعنی وہ لوگ جو سیدھے راستے صراطِ مستقیم کو چھوڑ کر اپنی مرضی کے راستوں پر چلتے ہوئے ادھر ادھر نکل جاتے ہیں لیکن) مایوسی کی کوئی بات نہیں ہے اب بھی وہ لوگ جن کے دل قرآن یعنی ذکر اللہ سن کر نرم نہیں ہوتے اگر وہ اپنی عقل سے کام لیں تو ان کو بھی زندگی کا صحیح راستہ مل سکتا ہے۔ ان لوگوں کو اس بات کا علم ہو جانا چاہئے کہ اللہ ہی ہے جو زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کر دیتا ہے یعنی ایک ویران اور بنجر زمین بارش کے بعد کھیتوں اور باغوں سے ہری بھری ہو جاتی ہے۔ (اسی طرح اس قرآن یعنی ذکر اللہ کو سن کر اور عمل کر کے

انسانوں کی ویران اور بنجر زندگی جنت میں بدل سکتی ہے۔ ایسی جنت کہ جس کی بہاروں پر کبھی خزاں نہ آئے۔ جہاں پانی جو زندگی کی علامت ہے ان کے لئے پانی کی ایسی نہریں ہوں گی جو ہمیشہ بہتی رہیں گی) ہم نے اپنی باتیں تم کو واضح کر کے اور کھول کھول کر بیان کر دی ہیں تا کہ تم عقل سے کام لے کر ذکر اللہ' اللہ کی نصیحت کو سمجھو اور عمل کرو۔

(نوٹ: فاسق کا مطلب ہے صحیح راستے کو چھوڑ کر ادھر ادھر نکل جانے والا)

8۔ اور ہم نے نوحؑ اور ابراہیمؑ کو بھیجا اور ان کی اولاد میں پیغمبری اور کتاب (کے سلسلے) کو وقتاً فوقتاً جاری رکھا تو ان میں سے بعض تو ہدایت پر ہیں اور ان میں سے اکثر فاسقون ہیں۔ (57:26)

9۔ جو لوگ ایمان لائے ان کو ہم نے ان کا اجر دیا اور ان میں سے اکثر فاسقون ہیں۔ (57:27)

10۔ اور ہم پھر تاکید کرتے ہیں کہ جو (حکم) اللہ نے نازل فرمایا ہے اس کے مطابق فیصلہ کریں لیکن اکثر انسان نافرمان ہیں۔ (5:49)

11۔ کہو کہ اے اہل کتاب تم ہم میں برائی ہی کیا دیکھتے ہو سوائے اس کے کہ ہم اللہ پر اور جو کتاب ہم پر نازل ہوئی ہے اس پر اور جو پہلے نازل ہوئیں ان پر ایمان رکھتے ہیں اور (یقیناً) تم میں اکثر فاسقون ہیں۔ (5:59)

12۔ اور برے کاموں سے جو وہ کرتے تھے ایک دوسرے کو روکتے نہیں تھے۔ بلاشبہ وہ برا کرتے تھے۔ تم ان میں سے اکثر کو دیکھو گے کہ کافروں سے دوستی رکھتے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ آگے بھیجا ہے برا ہے اللہ ان سے ناخوش ہوا اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے اور اگر وہ اللہ اور نبی پر اور جو کتاب ان پر نازل ہوئی تھی اس پر یقین رکھتے تو ان لوگوں یعنی کافروں اور منافقوں کو دوست نہ بناتے، لیکن ان میں سے اکثر فاسقون ہیں۔ (5:79-81)

13۔ اور جب یہ لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے حالانکہ کفر لے کر آتے ہیں اور کفر کے ساتھ ہی واپس جاتے ہیں اور جن باتوں کو یہ چھپا کر رکھتے ہیں اللہ ان کو خوب جانتا ہے اور تم دیکھو گے کہ ان میں اکثر حرام کھانے میں جلدی کر رہے ہیں بے شک یہ جو کچھ کرتے ہیں برا کرتے ہیں اور بھلا ان کے مشائخ اور علماء ان کو گناہ کی باتوں اور حرام کھانے سے منع کیوں نہیں کرتے؟ بلاشبہ وہ بھی برا کرتے ہیں۔ (5:61-62-63)، مزید دیکھئے (9:34-35)

14۔ بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا کہ جو (شمار میں) ہزاروں ہی تھے اور موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکل بھاگے تھے تو اللہ نے حکم دیا کہ مر جاؤ پھر ان کو زندہ بھی کر دیا یقیناً اللہ لوگوں پر فضل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اکثر انسان شکر نہیں

کرتے۔ (2:243)

15۔ اور اکثر لوگ جو زمین پر آباد ہیں (گمراہ ہیں) اگر تم ان کا کہا مان لو گے تو وہ تمہیں اللہ کا راستہ بھلا دیں گے یہ محض خیالوں کے پیچھے چلتے ہیں اور نرے اٹکل کے تیر چلاتے ہیں۔ (6:116)

16۔ یہ لوگ تم سے الساعتہ کے بارے میں اس طرح پوچھتے ہیں گویا تم اس سے واقف ہو۔ ان کو میری طرف سے کہہ دو کہ اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے لیکن اکثر انسان اس بات کا علم نہیں رکھتے اور حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں۔ (7:187)

17۔ تم اس (قرآن) سے شک میں نہ پڑنا' یہ تمہارے رب کی طرف سے حق ہے لیکن اکثر انسان ایمان نہیں لاتے۔ (11:17)

18۔ اور اللہ اپنے کام پر غالب ہے لیکن اکثر انسان اس بات کا علم نہیں رکھتے۔ (12:21)

19۔ ہمارے لئے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ کسی چیز کو اللہ کے ساتھ شریک بنائیں یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر بھی اور اور لوگوں پر بھی، لیکن اکثر انسان شکر نہیں کرتے۔ (12:38)

20۔ (اس بات کو سن کر یاد کر لو کہ) اللہ کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر انسان اس بات کا علم نہیں رکھتے۔ (12:40)

21۔ اور جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے حق ہے لیکن اکثر انسان ایمان نہیں لاتے۔ (13:1)

22۔ اللہ کے وعدے سچے ہوتے ہیں جن کو وہ ضرور پورا کرتا ہے۔ لیکن اکثر انسان اس بات کا علم نہیں رکھتے (کہ اللہ اپنے وعدوں کو ضرور پورا کرتا ہے) (16:38)، (30:6)

23۔ قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا اور یہ کہتا تھا کہ یہ مال و دولت مجھے میرے علم کے زور پر ملا ہے۔ کیا اس کو معلوم نہیں کہ اللہ نے اس سے پہلے بہت سی امتیں جو اس سے قوت (وطاقت) میں بڑھ کر اور جمعیت میں زیادہ تھیں یعنی ان کی جماعت تعداد کے لحاظ سے بڑی تھی ہلاک کر ڈالی ہیں اور مجرموں سے ان کے جرائم کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔ (اس لئے کہ مجرم اس کو کہتے ہیں کہ جس کا جرم ثابت ہو چکا ہو جس کو صرف سزا دینا باقی ہوتا ہے اس لئے مجرم سے مزید پوچھ گچھ نہیں کی جاتی صرف سزا دی جاتی ہے) (28:78)

24۔ بہت سے انسان اپنے رب سے ملنے کے قائل ہی نہیں۔ (30:8)

25۔ اسلام ہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر انسان اس بات کا علم نہیں رکھتے۔ (30:30)

26۔ اکثر لوگ اس بات کا علم نہیں رکھتے کہ رزق کی فراخی اور تنگی اللہ کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتی ہے۔ (34:36)

27۔ جہنم میں جانے والے جہنم میں اس لئے گئے کہ وہ اپنے گمراہ باپ دادا کے پیچھے دوڑے چلے جاتے تھے اور ان سے پہلے بھی اکثر لوگ گمراہ ہو گئے تھے۔ (37:69-71)

28۔ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے کی نسبت بڑا کام ہے لیکن اکثر انسان اس بات کا علم نہیں رکھتے۔ (40:57)

29۔ قیامت تو آنے والی ہے اس میں شک CONFUSION والی کوئی بات نہیں ہے لیکن (یہ جاننے کے باوجود) اکثر لوگ ایمان نہیں رکھتے (اور غلط کام کئے جاتے ہیں) (40:59)

30۔ رات آرام کرنے کے لئے اور دن کام کرنے کے لئے ہے اللہ انسانوں پر فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر انسان شکر نہیں کرتے۔ (40:61)

31۔ اے رسول میری طرف سے کہہ دیجئے کہ اللہ ہی تم کو زندگی دیتا ہے اور وہی تم کو موت دیتا ہے پھر قیامت کے روز جس کے آنے میں کوئی شک وشبہ CONFUSION نہیں ہے تم کو جمع کرے گا لیکن اکثر انسان اس بات کا علم نہیں رکھتے۔ (45:26)

32۔ مجرمین کے پاس جب حق بات پہنچتی ہے تو ان میں اکثر ناخوش ہوتے تھے۔ (43:78)

33۔ اور ہم نے تمہارے پاس صاف اور واضح آیات نازل کیں اور ان سے وہی انکار کرتے ہیں جو فاسقون ہیں۔ ان لوگوں نے جب جب اللہ سے عہد واثق کیا تو ان میں سے ایک فریق نے اس کو کسی چیز کی طرح پھینک دیا حقیقت یہ ہے کہ ان میں اکثر بے ایمان ہیں۔ (2:99-100)

34۔ ایمان لانے والے تھوڑے ہیں مگر اکثر فاسقون ہیں۔ (3:110)

35۔ کافر اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں اور یہ اکثر عقل نہیں رکھتے۔ (5:103)

36۔ ایسے لوگوں کی خواہشوں کے پیچھے نہ چلو جو خود بھی (پہلے) گمراہ ہوئے اور پھر اکثریت کو گمراہ کر گئے اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔ (5:77)

37۔ اگر ہم ان پر فرشتے بھی نازل کر دیتے اور مردے بھی ان سے بات کرنے لگتے اور ہم سب چیزوں کو ان کے سامنے لا موجود کر بھی دیتے تو بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے۔ الا ماشاءاللہ، بات یہ ہے کہ ان کی اکثریت نادان ہے۔ (6:111)

38۔ شیطان نے اللہ سے کہا کہ میں تیرے بندوں کو صراط مستقیم سے بھٹکاؤں گا اور اکثر انسانوں کو تو اپنا شکر گزار نہیں پائے گا۔ (7:11-17)

39۔ اللہ نے کہا کہ جو لوگ شیطان کی تابعداری کریں گے ان سب سے جہنم کو بھر دوں گا (7:18)

40۔ نافرمان قوم میں سے اکثر لوگ اپنے کئے ہوئے عہد کی پابندی نہیں کرتے تھے اور اکثر کو دیکھا تو فاسقین ہی دیکھا (7:102) مزید دیکھئے (9:8)

41۔ اللہ کا وعدہ الحق ہے لیکن اکثریت اس بات کا علم نہیں رکھتی۔ (10:55)

42۔ اللہ انسانوں پر فضل کرتا ہے لیکن اکثریت شکر ادا نہیں کرتی (10:60)

43۔ اکثر انسان علم نہیں رکھتے۔ (16:75)

44۔ انسان اللہ کی نعمتوں سے واقف ہے مگر اس کے باوجود انکار کر دیتے ہیں کہ اکثریت ناشکروں کی ہے (16:83)

45۔ اللہ کی قدرت دیکھ کر بھی اکثریت ایمان نہیں لاتی (26:1-8)

46۔ تاریخی واقعات سن کر بھی اکثریت ایمان نہیں لاتی۔ (26:52-67) مزید دیکھئے اسی سورت کی آیات، 190,174,158,139,121,103 تمام آیات کو سیاق وسباق سے پڑھئے۔

47۔ اللہ کی قدرت کو دیکھ کر بھی اکثریت عقل سے کام نہیں لیتی (29:63)، (31:25)

48۔ جو لوگ غفلت میں زندگی گزارتے ہیں ان میں سے اکثریت پر اللہ کی بات پوری ہو چکی ہے۔ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ (19:31)

☆.....☆.....☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شرحِ جاوید نامہ شائع ہوگئی!

مفکرِ قرآن غلام احمد پرویز علیہ الرحمتہ کے لیکچرز کی تحریر پر مشتمل اپنے انداز کی منفرد شرح جاوید نامہ شائع ہوگئی ہے۔ بڑے سائز کے 800 صفحات پر مشتمل اِس یکتائے روزگار شرح کی قیمت صرف ایک ہزار روپے ہے۔ ''جاوید نامہ'' کیا ہے اس کے متعلق پرویز علیہ الرحمتہ کی زبانی خود ملاحظہ فرمایئے:۔

''علامہ اقبالؒ کی فارسی کی کتاب ہے ''جاوید نامہ''۔ اگر آپ نوجوانوں کو اسلام کی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو میں یہ عرض کروں گا' مبالغے کی بات نہیں ہے' یہ ایک کتاب ''جاوید نامہ'' پڑھا دیجئے لیکن اس کے پڑھانے کے لیے ایسے لوگوں کی یا ایسے شخص کی ضرورت ہوگی جو علومِ حاضرہ کے اوپر پوری دسترس رکھتا ہو۔ یہ بڑی جامع کتاب ہے اور میں سمجھتا ہوں یہ اقبالؒ کی فکر کا شاہکار ہے۔ تاریخ عالم پہ نگاہ' مذاہبِ عالم پہ نگاہ' سارے فلسفے کے اوپر نگاہ' الٰہیات کے اوپر نگاہ' سوشیالوجی کے اوپر نگاہ' تمدن کے اوپر نگاہ' نظام کے اوپر نگاہ' سب سے بڑی یہ چیز کہ قرآن کی گہرائیوں کے اوپر بڑی نگاہ۔ اگر کہیں یہ چیز نصاب کی اس انداز سے سامنے آئے پھر آپ دیکھئے گا کہ انہی نوجوانوں کی ذہنیت کیسے بنتی ہے اور کیا بنتی ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ کوئی دوسری قوم آئے گی۔ بڑا حسین انداز ہے۔ اقبال کے الفاظ ہیں وہ اس انداز سے بات شروع کرتا ہے کہ یہ نظام آیا تو ملوکیت بھی گئی اور یہ پاپائیت بھی گئی اور سرمایہ داری بھی گئی یہ سب چیزیں انہوں نے اُڑا دیں۔ میرے دل کے اندر جو بات چھپی ہوئی ہے آج میں اسے بے نقاب کہہ دینا چاہتا ہوں۔ الفاظ نہیں مل رہے یہ کہنے کے لیے کہ میں کیا کہوں کہ یہ قرآن ہے کیا' یہ کتاب تو نہیں کچھ اور ہی ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ جب جان کے اندر کسی کے یہ اتر جاتی ہے تو جان بدل جاتی ہے اور جب جان بدل جاتی ہے تو دنیا بدل جاتی ہے''۔

(بحوالہ دروس القرآن سورۃ المائدہ آیات 51 تا 56)

منگوانے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام 25-B گلبرگ 2، لاہور۔54660، پاکستان
فون: 042-35714546 Idara@toluislam.com

راجہ عبدالعزیز (دھیرکوٹ آزاد کشمیر)

آخری قسط

نظریۂ اِرتقاء

Special Creation v/s Evolution

ڈارون اچھی طرح جانتا تھا کہ جونہی اس کا نظریہ منظرعام پر آئے گا تو ایک طوفان کھڑا ہو جائے گا۔ اور اس نے اپنی کتاب کی اشاعت سے 15 سال پہلے ایسے ایک طوفان کا مشاہدہ کر بھی لیا تھا۔ ہوا یوں کہ 1844ء میں ایک کتاب سامنے آئی۔ مصنف نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا تھا۔ کتاب کا نام 'Vestiges of the natural history of creation' تھا۔ اس میں اس عقیدے کا اظہار کیا گیا تھا کہ انسان خالق کی مداخلت کے بغیر ادنیٰ درجہ کے پرامیٹس (Primates) سے ظہور میں آیا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت پر بہت ہنگامہ آرائی ہوئی تھی۔ اس کتاب کی برطانیہ اور بیرونی دنیا کے ہر چرچ میں پادریوں نے بھرپور مخالفت کی تھی اور اس تصنیف کو جہنمی قرار دیا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ یہ کتاب ڈارون نے لکھی ہے۔ حالانکہ اس کتاب کا مصنف ایک کامیاب مگر سیدھا سادا اسکاٹش پبلشر رابرٹ چیمبرز تھا۔ اپنے نام کو اس لئے خفیہ رکھا تھا کیونکہ اس کا ادارہ بائبل کی چھپائی کا کام کرتا تھا۔ ڈارون کو درست اندازہ ہو گیا تھا کہ رابرٹ ہی اس کتاب کا مصنف ہے لیکن اپنی شرافت اور وضع داری کے سبب اس نے اس مسئلہ پر رابرٹ سے بات تک نہیں کی۔ پھر ایک ایسے مذہبی نظریے نے بھی اسے کافی مضطرب اور پریشان کر رکھا تھا جسے 1802ء میں برطانوی مذہبی امور کے ماہر ولیم پیلے نے پیش کیا تھا۔ اور اسے 'Argument from design' کا نام دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر ہمیں راستے میں پڑی گھڑی مل جائے تو ہم یہی خیال کریں گے کہ اسے کسی ماہر کاریگر نے بنایا ہوگا۔ لہٰذا ''فطرت کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کی پیچیدگی سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے ڈیزائن کرنے والی کوئی مافوق الفطرت ہستی تھی اور یہی اس بات کا جامع ثبوت تھا''۔ 19 ویں صدی کا یہ بھی ایک طاقتور عقیدہ تھا۔ اور اس نے ڈارون کو بڑی مشکل میں ڈال رکھا تھا۔ اس نے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے تسلیم کیا کہ ''آج بھی اسے سوچ کر میرے پسینے چھوٹ جاتے ہیں''۔ اس نے اپنی کتاب اوریجن..... میں کھلے دل سے اعتراف کیا ''میں خود کو انتہا درجے کا احمق تصور کرتا ہوں کہ فطری انتخاب ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ایسا موثر ہتھیار دے دے گا''۔ یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ اگر ڈارون کو اپنی تھیوری سے ہاتھ دھونے کا خوف نہ ہوتا تو وہ اپنی کتاب ہرگز نہ چھپواتا۔

تاہم ان تمام خطرات اور مشکلات کے باوجود ڈارون نے اپنے مسودے کو پھیلانے اور کتاب کی شکل میں مرتب کرنے کے کام پر عملدرآمد شروع کر دیا۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد 1859ء کے آخر میں 1250 کتابوں پر مشتمل اس کا پہلا ایڈیشن منظرعام پر آیا اور

یہ تمام کتابیں پہلے روز ہی فروخت ہوگئیں۔ کتاب کے سامنے آنے پر ڈارون کے تمام خدشات دُرست ثابت ہوئے مذہبی اور سائنسی حلقوں کی طرف سے اس پر تنقید کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ نظریہ کی تائید میں فوسلز کی شہادتیں مفقود تھیں۔ لوگ اس سے سوال کرتے کہ ان تبدیلیوں کے عمل سے گذرنے والے جانوروں کے ڈھانچے کہاں ہیں جن پر تمہارا اتنا زور ہے۔ مگر فاضل مصنف کے ہاتھ ایک فوسل بھی نہ آیا جو ثابت کرتا کہ فلاں جانور موجودہ حالت سے پہلے اس صورت میں تھا۔ اس وقت تک دستیاب ریکارڈ کے مطابق کیمبرین پیریڈ تک زندگی کا کوئی وجود نہیں تھا۔ ڈارون نے زور دے کر کہا کہ ''میرے اس نظریے کی مکمل وضاحت ابھی ممکن نہیں۔ شہادتوں کا فقدان ہی میرے اس نظریے کے خلاف ایک اہم دلیل بن سکتی ہے''۔ بقول برائسن ''گو اس نے اپنی کمزوری کا اعتراف کیا لیکن کسی دوسرے امکان کو قبول کرنے سے یکسر انکار کر دیا''۔ ایک اور مضحکہ خیز امر یہ تھا کہ ڈارون نے کتاب کا نام ''اوریجن آف سپیشیز'' رکھا تھا۔ مگر انواع کے اوریجن یا ابتداء کے بارے میں کتاب میں کچھ بھی درج نہ تھا۔ برائسن اس مسئلے پر کہتے ہیں۔ ''اس کے نظریہ کی رو سے ایک طریق کی نشان دہی ہوتی تھی کہ جانوروں کی اقسام کس طرح بہتر' تیز تر یا طاقتور ہوتی ہیں۔ دوسرے معنوں میں وہ تنومند یا موزوں کیسے بنتی ہیں۔ لیکن اس میں کوئی بھی ایسی نشاندہی نہیں تھی جس سے پتہ چلتا کہ قدیم اقسام نئی اقسام کی تخلیق کیسے کرتی تھیں اور یہ تبدیلیاں ان میں کیسے اور کب رونما ہوئی تھیں''۔

فلیمنگ جنکن جو ایک سکاٹش انجینئر تھا' نے اس مسئلے پر گہرائی میں جا کر غور کیا اور ڈارون کے نظریہ میں اسے ایک بہت بڑی خامی قرار دیا۔ ڈارون کا یقین تھا کہ جب کسی نسل میں کوئی فائدہ مند اضافہ واقع ہوتا اور اس کی ہیئت میں تبدیلی آتی تو یہ خود بخود آگے والی نسل میں منتقل ہو جاتی اور اس طرح مجموعی طور پر اس قسم میں بہتری واقع ہو جاتی۔ لیکن جنکن نے اسے مسترد کرتے ہوئے کہا کہ ''اگر اک نسل میں حسب حال یا مفید تبدیلی ہوئی تو اگلی نسل میں یا نسلوں میں یہ تبدیلی غالب حیثیت حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے برعکس آمیزش کے باعث اس میں کمزوری کا زیادہ امکان تھا۔ جن کن نے اس کی مثال وہسکی سے دی ہے کہ اگر اس میں پانی ملا دیں تو وہسکی کی طاقت میں اضافہ نہیں بلکہ اس کی طاقت اور کم ہو جائے گی۔ اور یہ بھی کہ ''اس طرح والدین اگر کوئی مفید عادت یا تغیر اپناتے ہیں تو آنے والی نسلوں میں یہ بتدریج کمزور ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ یہ سرے سے معدوم ہو جائے گا''۔ بل برائسن اس باب پر یوں تبصرہ کرتے ہیں۔ ''پس ڈارون کا نظریہ تبدیلی کا تیر بہدف نسخہ نہ تھا۔ البتہ بقا کے اصول کو اس سے تقویت ضرور ملتی تھی۔ وقتاً فوقتاً اتفاقات وارد ہوتے رہے جن سے نتائج اخذ کرنے میں سہولت میسر آتی رہی۔ لیکن مجموعی طور پر یہ خوش قسمت حادثات جوں جوں وقت گزرتا رہا اپنی اہمیت کھو بیٹھے اور حالات نئے سرے سے پرانی ڈگر پر آ گئے۔ ''فطری انتخاب'' کو کامیابی سے ہمکنار کرانے کے لئے لازم تھا کہ متبادل طریقہ ڈھونڈا جائے جو اس سے پہلے کسی نے نہ سوچا ہو''۔ ڈارون کے قریبی دوست بھی اس کے بعض خیالات سے کم ہی اتفاق کرتے تھے۔ ڈارون کے ایک استاد نے کہا ''کتاب پڑھ کر مجھے خوشی سے زیادہ تکلیف ہوئی''۔ لوئیس اگاسز نے اسے ایک ناکام

کوشش کہہ کر رد کر دیا۔ یہاں تک کہ اس کا وفادار دوست لائل بھی پکار اٹھا ''ڈارون اس کتاب میں حد سے تجاوز کر گیا ہے''۔ ڈارون سے پہلے لیمارک نے جسم حیوانی میں تغیرات کی وجہ کسی عضو کا استعمال اور عدم استعمال بتائی تھی۔

ڈارون کے ناقدین میں ایک اہم نام ٹی۔ ایچ ہکسلے کا ہے۔ اسے ڈارون کے لمبے ارضیاتی دورانیوں پر اعتراض تھا وہ خود ایک سالٹیشنسٹ (Saltationist) تھا اور ایک چھلانگ یا فوری تبدیلی کا قائل تھا۔ یعنی اس کے خیال میں ارتقائی تغیرات بتدریج رونما نہ ہوئے تھے بلکہ یہ ترقی فوری طور پر ہوئی۔ (سالٹیشن لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ''چھلانگ'' ہیں) ان لوگوں کے خیال میں اجزا آہستہ آہستہ وجود میں نہیں آ سکتے تھے۔ آج کل اس نظریے کو فجائی ارتقاء کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ لیکن اس کا تعلق صرف کسی نوع کی پیدائش سے ہے۔ کسی چیز کی پیدائش کے بعد اس کا ارتقاء بتدریج ہی ہوتا ہے۔ جیسے انسانی ذہن کا ارتقاء۔ ایک بات جس پر ہر خاص وعام شخص زور دیتا ہے اور اس کے نظریے کی ناپسندیدگی کی غالباً سب سے اہم بنیاد بھی یہی ہے کہ اس کی دلیل تھی کہ انسان بندر کی ارتقائی شکل ہے۔ حالانکہ اس نے اپنی کتاب میں صرف ایک بار اس جانب ہلکا سا اشارہ دیا تھا۔ تاہم ڈارون کے دلائل سے اس نتیجے پر پہنچنا کوئی خاص مشکل بھی نہیں تھا۔ آخر کار 1871ء میں ڈارون نے اپنی کتاب 'Descent of man' شائع کروا کر بندروں سے ہماری وابستگی کی واضح طور پر توثیق کر دی۔ لہٰذا یہ کتاب پہلی کتاب سے بھی زیادہ متنازعہ ثابت ہوئی۔ ڈارون کے اس موقف پر برائسن کا کہنا ہے۔ ''یہ ایک دلیرانہ قدم تھا۔ کیونکہ فوسلز ریکارڈز کے ضمن میں اس کے پاس نظریے کو ثابت کرنے کے لئے کوئی بھی شہادت موجود نہیں تھی''۔ لہٰذا جناب فتح اللہ کا یہ کہنا تو درست ہے کہ

"No one has seen or could prove that apes are transfigured in human beings.----Verily, We have honoured the children of Adam 17:70"

لیکن انہوں نے قرآنی آیات 2:65-66 کی جو تشریح کی ہے کہ اللہ نے نافرمان بندوں کو واقعی بندر بنا دیا تھا' محلِ نظر ہے۔ ان آیات کی ایسی تشریح کرنے والے جناب فتح اللہ اکیلے نہیں ہیں۔ کئی دوسرے علماء نے ایسی ہی تشریح کی ہے۔ لیکن فتح اللہ صاحب۔ ایک ایسی حقیقت سے بھی آگاہ ہیں اور اسے تسلیم بھی کرتے ہیں کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بات کو سمجھانے کے لئے۔ استعارے' کنائے اور امثال بھی استعمال کئے ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ میں

"The following Quranic Verses wich are from the heavenly scripture giving wisdom and guidence reveal to mankind symbolically and as directly...."

جناب فتح اللہ کے کہنے کے مطابق اگر ان آیات کے علامتی معنی لئے جائیں تو مطلب ہوگا ان کی سیرت بندروں جیسی ہوگئی تھی یعنی یہ لوگ اسی دنیا کی زندگی میں ذلت وخواری کا مجسمہ بن گئے تھے۔ احتساب بھی صرف انسانوں کا ہوگا۔ جانور تو حساب کتاب سے آزاد

ہیں۔لہٰذا قوانین قدرت کے مطابق اگر بندر انسان نہیں بن سکتا تو قابلِ تکریم بنی آدم 17:70 بھی بندر کے پیکر میں نہیں ڈھل سکتا۔

بل برائسن نے کہا تھا کہ ''فطری انتخاب'' کی کامیابی کے لئے ایسا متبادل طریقہ ڈھونڈا جائے جو کسی نے نہ سوچا ہو۔اور یہ خیال ڈارون کی زندگی میں ہی اس کی اور ویلس کی بے خبری میں ایک تنہا پسند راہب گریگر مینڈل نے سوچ لیا۔وہ 1822ء میں آسٹریا کے ایک غریب کسان خاندان میں پیدا ہوا۔بعد میں وہ پادری بن کر برنو کی خانقاہ میں درس وتدریس میں مصروف رہا۔برائسن کے مطابق مینڈل ایک تربیت یافتہ سائنسدان تھا۔اس نے ویانا یونیورسٹی سے طبعیات اور حساب کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔اس کی لائبریری میں بیس ہزار کے قریب کتابیں موجود تھیں۔اس نے وراثت کے مطالعے کے لئے پودوں پر تحقیق شروع کر دی۔اس نے اندازہ کر لیا کہ ایک سادہ خصوصیت دو ذرات سے تشکیل پاتی ہے۔اب ان کو جینز کہا جاتا ہے۔مینڈل نے جین (Gene) کا لفظ استعمال نہیں کیا کیونکہ یہ لفظ 1913ء میں انگلش میڈیکل ڈکشنری میں شامل ہوا تھا۔اس کی جگہ اس نے 'Dominent' اور 'Recessive' اصطلاحیں ایجاد کیں۔اس نے ثابت کیا کہ ہر بیج میں دو رکن یا عناصر ہوتے ہیں ان میں سے ایک حاوی Dominent اور دوسرا مغلوب (Recessive) ہوگا۔اور جب یہ دونوں یکجا ہوتے ہیں تو موروثیت کے متوقع نمونے ایجاد کرتے ہیں۔مینڈل نے اپنی تحقیقات کی ابتداء مٹر کے بیج سے کی تھی۔لمبی مٹر سے چھوٹی مٹر کا جوڑ الگانا' جس طرح بڑی نسل اور چھوٹی نسل کو ملا کر دوغلی نسل کی ابتدا کی جاتی ہے۔اس نے شہد کی مکھی کی ایک نئی نسل بھی پیدا کی تھی۔اس دوغلی مکھی کا شہد بہترین اور مقدار میں بھی زیادہ ہوتا تھا۔لیکن اتنی بد مزاج تھی کہ یہ میلوں تک کسی کو ڈنگ مارے بغیر نہیں چھوڑتی تھی چنانچہ اس نسل کو ختم کرنا پڑا۔کوئی چار سال پہلے ہمارے علاقے میں بھی ایسی ہی خطرناک شہد کی مکھیاں آئی تھیں۔جو بھی ان کے نرغے میں آتا اسے بری طرح زخمی کر دیتی تھیں۔کئی خواتین وحضرات بے ہوش ہو جاتے تھے۔جنہیں ہسپتال داخل کرنا پڑتا تھا۔میرے سامنے میرے بھائی کے جوان بکرے کو ایسے بھیانک انداز سے کاٹا کہ وہ مر گیا۔غالباً یہ مکھیاں بھی اسی دوغلی نسل کی باقیات میں سے تھیں۔مینڈل نے آٹھ سال کی تحقیق کے بعد 1866ء میں اپنے نتائج شائع کئے اور بقول برونوسکی فوری ناکامیاں حاصل کی۔کسی نے اس کی تحقیق کو نہیں سمجھا۔دراصل وہ جینیاتی علم کا بانی تھا جس کے بارے میں اس وقت کسی کو کوئی علم نہیں تھا۔اس کی دریافتیں اثر کے اعتبار سے بیسویں صدی سے تعلق رکھتی ہیں جب 'Genetics' کا علم پھلنے پھولنے لگا۔

ڈارون کی کتاب شائع ہونے کے بعد بندر سے انسانی رشتے داری کے معاملے نے بحث ومباحثوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا۔اسی سلسلے میں 1860ء میں ''برٹش ایسوسی ایشن فار دی ایڈوانسمینٹ آف سائنسز'' کی ایک میٹنگ کے دوران معاملے نے انتہائی شکل اختیار کر لی اور جوالا مکھی پھٹ پڑا۔ڈارون حسبِ معمول اس جلسے میں موجود نہیں تھا مگر اس کا حریف ہکسلے موجود تھا۔اس کے علاوہ اس کے مخالفین میں آکسفورڈ کا بشپ ولبرفورس بھی حاضر تھا۔اس نے اپنی تقریر کے دوران اچانک ہکسلے کی طرف اشارہ

کر کے اس سے پوچھا کہ آیا وہ ایسے نظریہ سے وابستگی کا اعتراف کرے گا جس کے مطابق اس کے دادا دادی بندر تھے۔ بکسلے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اچانک یا فوری تبدیلی کا قائل تھا مگر محض ایک اتفاقی امر کو اپنی ذاتی توہین سمجھا اور غصے سے تھر تھر کانپتے ہوئے اٹھ کر کہا کہ وہ بندروں سے رشتہ داری کو اس شخص سے تعلق پر ہزار گنا فوقیت دے گا جو اپنی حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک ایسے معاملے میں ٹانگ اڑائے اور بے سروپا گفتگو کرے' ایک ایسی جگہ جو سنجیدگی کی خواہاں ہے اور جہاں اہم معاملات زیر بحث ہیں جس سے اس کا دور کا تعلق بھی نہیں۔ بکسلے کا یہ کہنا اہانت کے زمرے میں آتا تھا جس سے آکسفورڈ کے بشپ کی عزت خاک میں مل گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طوفان بدتمیزی بپا ہو گیا۔ سخت ہنگامہ آرائی میں ایک خاتون بے ہوش ہو گئی۔ اس جلسے میں ہیگل جہاز کا کپتان فزرائے بھی موجود تھا۔ وہ بچارہ ایک سیدھا سادہ عیسائی تھی۔ اس نے بائبل کو سر سے اوپر اٹھا رکھا تھا اور ادھر ادھر بھاگ کر اور چلا چلا کر ''کتاب'' ''کتاب'' کی دہائی دے رہا تھا۔ مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا۔ بعد میں طرفین سے مخالف فریق کو چت کرنے کا دعویٰ خاصے زور شور سے کیا گیا۔ زندگی میں ڈارون کو متعدد بار اعزازات سے نوازا گیا لیکن ''اوریجن آف سپیشز'' یا ''ڈس سینٹ آف مین'' کے لئے اسے کچھ بھی نہ ملا۔ اسے نظریہ ارتقاء کی بجائے ارضیات' حیوانات اور نباتات پر غیر معمولی کارکردگی کے اعتراف میں اعزازات سے نوازا گیا۔ ''سر'' کا خطاب نہ ملنے کے باوجود 1882ء میں اس کے انتقال پر اسے ویسٹ منسٹر ایبے میں نیوٹن کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ دو سال کے بعد مینڈل بھی فوت ہو گیا۔

ڈارون کی پہلی کتاب ہمیشہ باعث نزاع رہی۔ اس کتاب کی دستیابی میں کبھی مشکل نہیں ہوئی لیکن اس کتاب اور تنقید کا چولی دامن کا ساتھ رہا۔ حتیٰ کہ اس کے اکثر حامی بھی اس بک بک جھک جھک سے تنگ آ گئے لیکن وہ اپنے مؤقف پر اڑا رہا۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ رفتہ رفتہ اس کے نظریہ ارتقاء سے برگشتہ ہو گئے۔ آخر کار تاریخ کے ماہر اور سائنسدان جیفری شوارز کے بقول ''ڈارون کو ادنیٰ درجے کے تاریخ دانوں اور ماہرین ارضیات میں جو تھوڑی بہت مقبولیت حاصل تھی وہ اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا''۔ درحقیقت ڈارون خود ایک مذہبی عالم تھا اس نے باقاعدہ عیسائیت کی تعلیم حاصل کی تھی لہٰذا وہ تمام مذہبی عقائد سے نہ صرف آگاہ تھا بلکہ ان پر اس کا یقین بھی تھا۔ لیکن ایک حادثہ اسے سائنس کی دنیا میں لے آیا حالانکہ سائنسی تعلیم سے اس کا برائے نام تعلق تھا۔ سائنسی دنیا میں آ کر وہ سائنسدانوں کے نظریات سے لاتعلق نہیں رہ سکتا تھا اور اس زمانے میں اکثر سائنسدانوں کا نظریہ مادہ پرستانہ تھا۔ 19ویں صدی سائنسدانوں کی فتح و کامرانی اور ظفر مندی کی صدی تھی۔ یہ فتح و کامرانی انہیں چرچ کی شکست کے بعد نئی نئی ملی تھی۔ یوروپ میں سائنس اور مذہب کی باہمی معرکہ آرائی کا ایک طویل پس منظر ہے۔ یوروپ جب توہم پرستی اور جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا تو جو کوئی بھی غرناطہ اور قرطبہ کی درس گاہوں کی پھیلائی ہوئی روشنیوں سے فیض حاصل کر کے اس معاشرے میں جاتا تو اس کا جینا محال ہو جاتا اور کئی لوگ اپنی جانیں بھی گنوا بیٹھتے۔ انہیں سخت قسم کی اذیتیں دی جاتیں۔ طرح طرح سے انہیں ذلیل و خوار کیا جاتا۔ ادھر مذہب

پرستوں کے پاس بھی خالص وحی پر مبنی دین نہیں تھا۔ اس میں انسانی خیالات، رجحانات اور تصورات کی آمیزش ہو چکی تھی۔ تاہم اس میں ابھی تک وحی کی کچھ تعلیمات موجود تھیں۔ لیکن سائنسدانوں اور ان کے حامی لوگوں نے مذہبی لوگوں کی طرف سے پیش کی جانے والی غلط اور صحیح تمام باتوں کو محض اپنی نئی نئی فتح کے نشے میں یکسر مسترد کر کے مادہ پرستانہ نظریات کو ایک عقیدے کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ میں اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ مادہ پرستی کا تعلق مادے کے خواص یا اجزا سے نہیں بلکہ تصورات سے ہے۔ مادہ چاہے صرف مادہ ہو یا صرف توانائی ہو یا ان دونوں کا امتزاج حتیٰ کہ برٹرینڈ رسل کے الفاظ میں صرف واقعات (Events) پر مشتمل ہو، ان کا تعلق مادی تصور حیات سے بالکل نہیں۔ مادی کائنات کا ایک حقیقی اور ٹھوس وجود ہے۔ قرآنی الفاظ میں یہ حق ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ ان مادہ پرستانہ نظریات کے مطابق کائنات کا کوئی خالق نہیں اور نہ ہی اس کا کوئی مقصد یا غایت ہے۔ اس کی تخلیق میں کسی شعوری ہستی کا کوئی کردار نہیں۔ یہ محض ہنگامی یا اتفاقیہ طور پر خود بخود وجود میں آ گئی ہے۔ اسی طرح انسان کی پیدائش بھی بغیر کسی خالق کے محض قوانین فطرت کے تحت اور بغیر کسی مقصد یا منزل کے ہوئی ہے۔ انسان اپنے طبیعی جسم کے خاتمے کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ آخرت کا بھی انکار کرتے ہیں یعنی دوسرے معنی میں مزید ارتقاء کے قائل نہیں۔ اس نظریے کے حامی لوگ انسانی تمدنی زندگی میں وحی یا انبیاءؑ کی وساطت سے کسی قسم کی راہنمائی کو ضروری نہیں سمجھتے۔ مادہ پرستی کے یہ تصورات کبھی مادہ پرستانہ نظریات، کبھی ہیومنزم (Humanism) کبھی میکانکی عمل اور کبھی نام نہاد سیکولرازم کی شکل میں سامنے آتے رہے ہیں۔ تاہم اب علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ سائنسدانوں میں بھی اعتدال آ رہا ہے۔

سائنسدانوں نے ان حقائق کا انکار کسی نئی سائنسی دریافت یا کسی نئے انکشاف کی بنیاد پر نہیں کیا۔ ان کا یہ انکار ضد و تکبر پرستی، انتقامی جذبے کے تحت تھا۔ کیونکہ یہ لوگ بھی چرچ کے ہاتھوں بڑی بڑی اذیتوں کا شکار ہو چکے تھے۔ 19ویں صدی کے سائنسدانوں سے پہلے بھی کوپرنیکس، کیپلر، گلیلیو اور نیوٹن اور بعد میں آئن سٹائن، نیل بوہر، لیمتر، فریڈ ہائل اور پال ڈیویز جیسے عظیم اور بلند مرتبہ سائنسدان گزرے ہیں جن کا اللہ پر پختہ ایمان تھا اور خدا کو خالقِ کائنات بھی مانتے تھے۔ اُن کا یہ ایمان ان کے سائنسی نظریات کی تشکیل میں رکاوٹ نہیں بنا۔ تو پھر ان سائنسدانوں نے ان حقائق کا انکار کس وجہ یا کس مجبوری کے تحت کیا؟ ڈارون بنیادی طور پر ایک مذہبی عالم تھا اس نے باقاعدہ کیمبرج یونیورسٹی سے مذہبی تعلیم کی ڈگری حاصل کی تھی۔ وہ ان حقائق کو اچھی طرح جانتا بھی تھا اور مانتا بھی تھا۔ اس نے کبھی بھی خدا کی ہستی سے انکار نہیں کیا۔ اسی لئے اس نے اپنی تھیوری کو بیس سال شائع نہیں کرایا اور نہ ہی اپنی زندگی میں شائع کرانا چاہتا تھا یہ تو ویلس والا حادثہ اچانک سامنے آ گیا اور اس نے دیگر سائنسدانوں سے متاثر ہو کر وضع کردہ اپنی تھیوری کو بالامر مجبوری شائع کرا دیا۔ ڈارون کتاب کی اشاعت سے پہلے بھی ہچکاہٹ کا شکار تھا اور کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد کی صورت حال سے وہ مزید پریشان ہو گیا۔ جس نے اس کی جسمانی اور ذہنی حالت پر بڑے بھیانک اثرات ڈالے۔ وہ ذہنی اور نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو گیا۔ بل برائسن کا خیال ہے کہ اسے یہ نفسیاتی بیماری جنوبی امریکہ میں ایک کیڑے کے کاٹنے سے لاحق ہوئی تھی۔ جبکہ برونوسکی

نے اسے مراقی (One suffering from malancholy or insanity) کا مریض قرار دیا ہے جو حقیقت سے زیادہ قریب ہے۔ میرے تجزیے کے مطابق نفسیاتی اور جذباتی دباؤ کے سبب اس کی شخصیت دو حصوں میں بٹ گئی تھی اور وہ شیزوفرینیا (Schezophrenia) کے مرض میں مبتلا ہو گیا تھا۔ یعنی نفسیاتی طور پر اس کی شخصیت عقلی اور جذباتی حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی جس کی وجہ سے آدمی مشین بن کر رہ جاتا ہے اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں پر بھی منفی اثر پڑتا ہے۔ مابعد الطبیعیاتی اصطلاح میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس کے نفسِ امّارہ اور نفسِ لوامہ کے درمیان کشمکش جاری تھی۔

بل برائسن نے اس بیماری کے بعد اس کی جسمانی حالت اور ذہنی کیفیت کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔ ''اس کے بعد اسے عجیب نفسیاتی الجھنیں لاحق ہو گئیں۔ کام سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ گھنٹوں بے حس و حرکت پڑا رہتا اور اس کی جسمانی حرکات بہت سریع ہو گئیں۔ ساتھ ہی اس کا دل خراب ہوتا اور قے آنے کو ہوتی' دل دھڑکتا' آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا' سر میں شدید درد ہوتا اور نقاہت کا احساس ہوتا' جسم کانپنے لگتا اور سانس بھی پھولنے لگتا۔ اسے اس دوران مایوسی کا شدید احساس ہوتا اور سر بھی چکراتا۔ ایک سادہ سی تشخیص یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ نفسیاتی بیماری میں مبتلا تھا جس نے اس میں جسمانی علامات پیدا کر دی تھیں۔

ہر دو صورتوں میں انتہائی مشکل کا سامنا تھا۔ وہ بیس منٹ سے زیادہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ زندگی کا باقی عرصہ زیادہ تر علاج معالجے میں گذارتا رہا۔ مختلف ٹوٹکے بھی اس نے آزمائے اور جو بھی کسی نے کہا کیا۔ برفیلے پانی میں نہایا۔ خود کو سرکے میں ڈبویا' جسم پر بجلی کے جھٹکے لگوائے۔ وہ تارک الدنیا ہو گیا اور شاید ہی گھر سے باہر نکلتا''۔ برونوسکی بھی ڈارون پر بیماری کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ ''وہ خود بھی اس صدمے کا شکار تھا۔ مراقی۔ اس پر گرم ملک کی آب و ہوا کا اثر تھا۔ دواؤں کی بوتلیں۔ اس کے گھر کا اور پڑھنے کے کمرے کا گھٹا ہوا ماحول۔ دوپہر کا قیلولہ۔ لکھنے میں سستی۔ عوام میں بحث و مباحثے سے انکار یہ سب باتیں اس حقیقت کا اظہار کرتی ہیں کہ وہ عوام کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا''۔ اس کے برعکس نوجوان ویلس اس طرح کی مشکلات میں مبتلا نہیں ہوا۔ تمام مشکلات کے باوجود وہ مشرق بعید پہنچ گیا تھا۔ یہ قدرے تفصیلی جھلک ایک ایسے ماہر فطرت (Naturalist) کے ذاتی حالات و واقعات کی ہے جس کے ذکر کے بغیر نظریۂ ارتقاء کی کوئی بھی بحث مکمل نہیں سمجھی جا سکتی۔

جناب یحییٰ نے اپنی کتاب میں خلیے پر ایک پورے باب میں بحث کے دوران دیگر مفید معلومات کے علاوہ دو باتوں پر خصوصی زور دیا ہے۔ پہلی بات یہ کہ خلیات اور دیگر نامیاتی سالمے انتہائی پیچیدہ ساخت کے ہیں اس لئے یہ اتفاقیہ طور پر خود بخود نہیں بن سکتے۔ اور دوسری بات یہ کہ انسان اپنی تمام تر ذہانت' علم' جدید ٹیکنالوجی اور اعلیٰ تجربہ گاہوں کے باوجود ابھی تک خلیہ نہیں بنا سکا۔ یہ دونوں باتیں ایسے حقائق ہیں جنہیں تقریباً تمام سائنسدان تسلیم کرتے ہیں۔ ان سے انکار کرنا تو دور کی بات ہے' ان کے بارے میں دو رائیں بھی نہیں ہو سکتیں۔ مگر ہارون یحییٰ (یہ ان کا قلمی نام ہے) جب ان حقائق کو نظریۂ ارتقاء سے منسلک کر کے انہیں ''بتدریج ارتقائی عمل'' کے خلاف ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں تو خود ہی ان حقائق کو مشکوک بنا دیتے ہیں۔ خلیے کا پیچیدہ ہونا یا انسان کا اس کے بنانے میں ابھی تک

ناکام رہنے کا تعلق کسی پہلو سے بھی نظریۂ ارتقاء سے نہیں بنتا۔ ایسا سمجھنا ان کی وہی غلط فہمی ہے جس کو ڈاکٹر رفیع الدین سامنے لائے تھے اور جس کا متعدد بار پہلے بیان ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں جناب یحییٰ کا خلیہ بنانے والے ماہرین کی کوششوں کو طنز کا نشانہ بنانا یا مذاق اڑانا بھی کوئی احسن بات نہیں۔ آپ ان کے بیان کردہ نتائج سے علمی دلائل کی بنیاد پر اختلاف کر سکتے ہیں۔ میں تو اس کے متعلق اپنا خیال ظاہر کر چکا ہوں کہ اگر زندگی کے سرچشمہ (Origin) کا تعلق عالمِ محسوسات سے ہے تو انسان اپنی خداداد صلاحیتوں کی نمو کر کے ایک دن اس کی بنیاد کا احاطہ کرے گا۔ اور اگر اس کا تعلق عالم امر سے ہے تو پھر کبھی بھی نہیں جان پائے گا کہ زندگی کہاں سے آئی ہے۔ لہٰذا میرے خیال میں خلیہ بنانے کی کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ ماہرین حیاتیات نے خلیہ اور اس سے دیگر خلوی اعضاء کو جس قدر مشکل اور پیچیدہ ظاہر کیا ہے' اسے ذہن میں رکھتے ہوئے بڑی آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی موجودہ علمی سطح ابھی تک اس مرحلے تک نہیں پہنچی جہاں جاندار خلیے کی تخلیق کر سکے۔ اگر انسان کو خلیہ بنانے کی صلاحیت حاصل ہو تب بھی یہ ابھی کافی مدت تک سونا بنانے والے حکیموں اور سنیاسیوں کی طرح محض ایک آنچ کی کسر کی وجہ سے ناکام ہوتا رہے گا۔ تاہم کوشش جاری رہنی چاہئے۔

قابل احترام قارئین کے علم میں آ چکا ہے کہ کیمیائی عمل کے تیسرے مرحلے میں پانچ سادہ نامیاتی مرکبات کے تعامل سے پانچ زیادہ پیچیدہ اور بڑے گروپ پیدا ہوئے جن کے ملاپ سے زندگی کی نمود ہوئی۔ ان پانچ مرکبات میں ایڈی نوسین' فاسفیٹ' پانی سیکرائیڈز' روغنیات' پروٹینز اور نیوکلی اک ایسڈز شامل ہیں۔ یہ پانچ کیمیائی مرکبات جب دیگر معدنیات کے ساتھ بارش کے پانی سے دھل کر سمندر میں جمع ہو گئے تو ان سے زندگی کی نمود ہوئی۔ انہی سات مرکبات سے خلیئے (cells) پیدا ہوئے۔ خلیہ زندگی کی بنیادی اکائی کا نام ہے۔ یہ خوردبین سے نظر آنے والا ایک قطرہ ہے۔ یہ زمین کے ارتقائی مراحل میں ایک اہم پیش رفت تھی۔ اس کے بعد نامیاتی (Organic) ارتقاء کی ابتدا ہوئی جو نوع انسانی کی پیدائش پر منتج ہوئی۔ ابتدائی خلیے دنیا کے مختلف سمندروں میں بہت سی غلطیوں اور آزمائشوں کے بعد بنے ہوں گے۔ کیونکہ اس معاملے میں کئی ممکنات سامنے ہیں۔ نامعلوم ان سات مرکبات کو یکجا ہونے میں اور ان کی صحیح اور متوازن مقدار کی ترتیب میں کتنی دیر لگی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ یہ مرکبات' خلیہ بننے کے آخری مرحلے پر پہنچنے سے پہلے کئی مرتبہ سمندر میں بہہ گئے ہوں یا یہ بھی ممکن ہے کہ یہ جزئیات خشک ہونے کے مرحلے سے گذرتے ہوئے بالکل خشک ہو گئے ہوں۔ تاہم لاکھوں کروڑوں سالوں کی بار بار غلط ابتدا اور نامکمل اختتام کے بعد کچھ خلیئے ساحلی مٹی سے سمندر کے پانی میں صحیح وسالم داخل ہو گئے۔ مادہ کی ان جزئیات کا ایک جگہ پر کافی مدت تک اکٹھا رہنا مشکل تھا کیونکہ سمندری پانی ان کو بہا کر پھر الگ الگ کر سکتا تھا۔ اس لئے ماہرین کے خیال میں یہ جزیات سمندری ساحل کی مٹی میں اکٹھی ہوئی تھیں۔ اور وہاں ان کے باہمی تعامل سے خلیئے بنے اب ان کے گرد جھلی بن چکی تھی اس لئے یہ سمندر کے پانی میں دوبارہ جا کر بھی محفوظ رہے۔ جس نوعیت کا کیمیائی مواد سمندر کے پانی میں جمع ہوا تھا اس کے بعد خلیوں کا معرضِ وجود میں آنا اتفاقی بات نہیں تھی بلکہ وقت کی بات تھی ایک نہ ایک دِن ایسا ہونا ضروری تھا۔

رابرٹ ہُک نے سب سے پہلے خلیہ کی ساخت کی وضاحت کی تھی۔ 1665ء میں اس کی ایک کتاب..... ''مائیکروگرافیا'' کی

اشاعت کے بعد اسے زبردست شہرت ملی۔ 1683ء میں لیون ہلوک نے اس وقت کی ایک طاقتور خردبین سے جراثیم دریافت کئے۔ رابرٹ براؤن نے 1831ء میں پہلی مرتبہ خلیئے کے مرکزہ کا مشاہدہ کیا اور اسے نیوکلیئس کا نام دیا۔ بل برائسن لکھتے ہیں ''فرانس کے لوئی پاسچر نے اس پر کافی کام کیا اور بالآخر 1860ء میں حتمی طور پر اس بات کی توثیق ہوگئی کہ زندگی اچانک وجود میں نہیں آسکتی بلکہ یہ پہلے سے ہی موجود خلیوں کی مرہونِ منت ہے۔ اسے سیل تھیوری کا نام دیا گیا''۔ خلیئے کی پیچیدہ ساخت پر انہوں نے تفصیل سے لکھا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ اگر خلیئے کو آدھے میل تک بڑا کر کے وسعت دی جائے تو ''اس کے اندر لاکھوں اجزا ہوں گے کچھ کا سائز باسکٹ بال جتنا ہوگا کچھ کاروں جتنے بڑے ہوں گے اور گولی کی طرح حرکت کرتے دیکھائی دیں گے۔ آپ کے لئے وہاں جگہ نہیں ہوگی کہ کھڑے ہوسکیں اور حرکت کرتے ہوئے جسم ہر طرف سے ہر لحہ آپ پر یلغار کر رہے ہوں گے''۔ وہ مزید بتاتے ہیں کہ ''ایک خلیئے میں تقریباً بیس ہزار اقسام کی پروٹینز ہوتی ہیں اور ان میں سے تقریباً دو ہزار ایسی ہیں جن میں سے ہر ایک میں پچاس ہزار کے قریب سالمے موجود ہیں۔ نوئیدا اس بارے میں کہتا ہے کہ اگر ہم صرف انہی سالموں کو گنیں جو تعداد میں پچاس ہزار سے زیادہ ہیں تو بھی ہر خلیئے میں ایک سو ملین سے زیادہ پروٹینز کے سالمے ہونے لازمی ہیں''۔ بل برائسن ATP (Adenosine Triphosphate) کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کے سالمے بیٹری کے سیلوں کی طرح توانائی سے بھرپور ہوتے ہیں یہ جگہ جگہ پھر کر جہاں جہاں خلیئے کو توانائی کی ضرورت ہوا سے مہیا کرتے ہیں۔ کسی بھی وقت ایک عام خلیئے میں ایک بلین کے قریب ATP سالمے موجود ہوتے ہیں اور دو ہی منٹوں میں ان میں سے توانائی کا ذخیرہ ختم ہوجاتا ہے اور ان کی جگہ توانائی سے بھرپور دوسرے بلین سالمے آجاتے ہیں۔ جب سالموں کی ضرورت نہیں ہوتی تو وہ عزت سے جان دے دیتے ہیں اور ان کی جگہ لینے کے لئے نئے خلیئے آجاتے ہیں۔ البتہ دماغی خلیئے مرتو جاتے ہیں لیکن ان کی جگہ نئے خلیئے پیدا نہیں ہوتے۔ بقول برائسن ''پیدائش کے وقت آپ کو 100 بلین کے قریب دماغی خلیئے عطا ہوجاتے ہیں اور ان پر زندگی بھر آپ کو گزارہ کرنا ہوگا۔ لہٰذا اگر آپ نے کوئی کام کرنا ہے تو اس میں دیر نہ کریں..... جب کوئی خلیہ وقت پر نہیں مرتا اور تیزی سے تقسیم ہونے لگتا ہے اور تعداد میں اضافہ کرتا ہے تو ہم اسے ''سرطان'' کہتے ہیں''۔

ہارون یحییٰ نے بھی خلیئے کے بارے میں بڑی اہم اور مفید معلومات مہیا کی ہیں۔ انہوں نے خلیئے کی پیچیدگیوں کو اُجاگر کیا ہے اور کئی ماہر حیاتیات اور دیگر حکمائے مغرب کے حوالے دے کر خلیئے کے اتفاقیہ طور پر تشکیل پاجانے کے امکان کو رَد کیا ہے۔ خلیئے کی پیچیدگی کے متعلق انہوں نے بائیولوجی کے پروفیسر مائیکل ڈینٹون کی تحریر کا ایک اقتباس دیا ہے جس میں وہ اس پیچیدہ نظام کو اس طرح بیان کرتے ہیں ''اس حقیقت کا کچھ ادراک کرنے کے لئے جو کہ ہمیں مالیکیولر بائیولوجی کے ذریعے علم میں آتی ہے، ہمیں ایک خلیہ کو ہزاروں ملین گنا زیادہ تصور کرنا پڑے گا۔ حتیٰ کہ اس کا نصف قطر بیس کلومیٹر جتنا ہو اور وہ ایک جناتی ائیرشپ جتنا بڑا ہو جو کہ ایک شہر مثلاً لندن یا نیویارک کو ڈھانپ لے۔ اس وقت جو کچھ ہمیں نظر آئے گا وہ ایک عدیم النظیر اور ناقابل تقلید پیچیدہ ڈیزائن ہوگا۔ خلیئے کی سطح پر ہمیں لاکھوں کی تعداد میں سوراخ (openings) ملیں گے جو کسی بڑے ایئرشپ کے پورٹ ہولز کی طرح ہوتے ہیں۔ یہ راستے

مختلف مادوں کی ہموار ترسیل اور آمد و رفت کے لئے مسلسل کھلتے اور بند ہوتے رہتے ہیں۔ اگر ہم ان میں سے کسی راستے میں داخل ہو سکتے تو ہم اپنے آپ کو عظیم ٹیکنالوجی اور مبہوت کر دینے والے پیچیدہ نظام میں کھڑا پائیں گے۔ ایک ایسی گنجلک اور محیر العقل پیچیدگی جو ہماری تخلیقی استطاعت اور استعداد سے قطعاً باہر ہے۔ ایک ایسی حقیقت جو کسی اتفاقی واقعے کے قطعاً مخالف ہے اور ایک ایسی ذہانت جو ہر شعبے اور ہر جہت میں انسانی ذہانت اور انسانی تخلیق سے برتر اور اعلیٰ ہے''۔ موجودہ وقت میں بھی ایسی زندہ اشیاء موجود ہیں جو ایک ہی خلیئے پر مشتمل ہیں اور ایسی بھی ہیں جو اربوں خلیات کا مجموعہ ہیں۔ نامیاتی مرکبات میں نیوکلی اک ایسڈز کی خصوصیات بڑی اہم ہیں۔ مثلاً یہ اپنی طرح کے دیگر سالمات تیار کرتا ہے۔ یہ نئی کیمیائی وضع یا ہیئت اختیار کر لیتا ہے جسے اچانک تبدیلی (mutation) کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ تنظیمی قوانین (Structural Code) کے ذریعے حیاتیاتی خبر رسانی کا کام دیتا ہے۔ مثلاً اگر ہم کچھ حروف کو ایک خاص ترتیب سے بولیں' مثال کے طور پر پ۔ا۔ک۔س۔ت۔ا۔ن تو یہ حروف ہمیں ایک خاص لفظ یعنی پاکستان کی خبر دیں گے اگر ان حروف کی ترتیب بدل دیں تو لفظ پاکستان کی جگہ کوئی دوسرا لفظ بن جائے گا۔ بالکل اسی طرح نیو کلیوٹائیڈز کو اگر ایک خاص ترکیب میں آگے پیچھے جوڑیں تو وہ ایک خاص پروٹین کی تعمیر کی خبر دیں گے۔ گویا نیوکلیوٹائیڈز کی خاص ترتیب سے پتہ چلے گا کہ کس قسم کے امینو ایسڈز اس میں فٹ ہو کر کون سا پروٹین بنائیں گے۔ چنانچہ ایک خاص پروٹین کا انحصار نیو کلیوٹائیڈز کی ایک خاص ترتیب پر ہوگا۔ امینو ایسڈز کی دو مختلف اقسام ہیں۔ دائیں اور بائیں ہاتھ والے۔ تمام جاندار نامیوں میں موجود لحمیئے صرف بائیں ہاتھ والے امینو ترشوں سے بنتے ہیں۔ زندگی کے عمل میں ایک دائیں ہاتھ والا امینو ایسڈز بھی سرگرم نہیں ہوتا۔

نیوکلی اک ایسڈز پروٹین کی تعمیر کی ترتیب کی اطلاع دیتا ہے۔ آج تمام جاندار اشیاء میں پروٹین کے تنظیمی ڈھانچے کی ہدایت نیوکلی اک ایسڈز کے ذریعے ملتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہر امینو ایسڈز کو صحیح جگہ اور صحیح ترتیب میں ہونا چاہئے۔ ورنہ صرف ایک امینو ایسڈز کی لحمیئے (Protein) کے ڈھانچے میں کمی' بیشی یا متبادل طور پر موجودگی لحمیئے کو ایک بیکار سالموں کے ڈھیر میں بدل دے گی۔ جیسے لفظ پاکستان کے حروف میں سے اگر ایک حرف کی ترتیب بدل دی جائے یا اضافہ کر دیا جائے تو اور الفاظ تو بن جائیں گے ''پاکستان'' کا لفظ نہیں بنے گا۔ ہر خلیئے پر 'Genetic Code' کا نقش موجود ہے جو ہر کسی کی مادی زندگی کے لئے ہدایت کا مینول ہے۔ عام طور پر خلیہ بیس مائیکرون چوڑا ہوتا ہے یعنی ایک ملی میٹر کا یہ تقریباً دو سواں حصہ ہوتا ہے۔ لیکن اس میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ بہت سی چیزوں یعنی فائٹو کونڈریا اور کروڑہا سالموں کو اپنے اندر پناہ دیتا ہے۔ خلیئے کے ایسے ہی عجائبات سے متاثر ہو کر برائسن کا کہنا ہے کہ ''خلیہ قدرت کا شاہکار ہے۔ ان میں سے سادہ ترین بھی انسانی عقل سے بعید ہیں۔ صرف خمیر (yeast) کا ایک خلیہ بنانے کے لئے آپ کو بوئنگ 777 کے تمام پرزوں کو چھوٹے پیمانے پر تیار کرنا ہوگا اور انہیں ایک ایسے کرے میں فٹ کرنا ہوگا جس کا قطر 5 مائیکرون ہو اور پھر اس کرے کو آپ کسی نہ کسی طرح قائل کریں گے کہ وہ افزائش بھی کرے۔ لیکن خمیری خلیئے انسانی خلیوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں' جو نہ صرف دقیق اور شکل و شباہت میں مختلف ہیں بلکہ اپنے پیچیدہ امتزاجی عمل کے لحاظ سے حد درجہ دلفریب ہیں''۔

خلیے کے وجود میں آنے کی وضاحت اس لئے بھی مشکل ہے کہ خلیے میں ''ناقابل تخفیف پیچیدگی وجامعیت'' پائی جاتی ہے ایک جاندار خلیہ بہت سے ہم آہنگ خلوی اعضاء کے تعاون سے اپنا وجود برقرار رکھتا ہے جو ایک شعوری کوشش سے ممکن ہے۔ محض اتفاق سے ایسا ہونا ناممکن ہے۔ ہارون یحییٰ نے خلیہ بنانے کی انسانی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے سٹینلے ملر، سڈنی فاکس، امریکی سائنسدانوں G.P. Ferris اور C.T. Chen کے حوالے دیئے ہیں۔ ملر کے تجربے کے بعد بڑی دھوم سے اعلان کیا گیا تھا کہ آخر میں کچھ امینو ایسڈز وجود میں آ گئے ہیں۔ لیکن یحییٰ صاحب نے متاثر کن دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ''اگر امینو ترشوں کو الگ نہ کر دیا گیا ہوتا اور ان کیمیائی مادوں کے ساتھ انہیں اسی ماحول میں رہنے دیا گیا ہوتا تو ان کی تباہی یا مختلف مرکبات میں ان کی تبدیلی یا اس کیمیائی ردِعمل سے تباہی ناگزیر تھی''۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ تمام کوششیں ایک ٹھوس منصوبہ بندی اور شعور کی بنیاد پر ہوئی ہیں۔ ان میں اتفاقات کی نہیں ذہانت کی کارفرمائی ہے۔ میرے خیال میں ان کا یہ کہنا درست اور ایک حقیقت ہے کہ ''درحقیقت ارتقا پسند اس تجربے سے خود نظریہ ارتقا کو مسترد کرتے ہیں اس لئے کہ اگر یہ تجربہ کسی شے کو ثابت کرتا ہے تو وہ یہ کہ امینو ترشوں کو صرف ایک کنٹرول میں رکھی گئی تجربہ گاہ کے ماحول میں پیدا کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تمام حالات خاص طور پر شعوری مداخلت کے ذریعے پیدا کئے گئے ہوں۔ یہ وہ طاقت ہے جو زندگی کو غیر شعوری اتفاق کے ذریعے وجود میں نہیں لاتی بلکہ شعوری تخلیق کے ذریعے وجود میں لاتی ہے۔ ارتقاء پسند اس واضح حقیقت کو کیوں نہیں تسلیم کرتے''۔ یہاں اگر ''ارتقا پسندوں'' کی جگہ ''مادہ پرستوں'' کے الفاظ ہوتے تو مناسب ہوتا۔ ارتقا پسند تو خود یحییٰ صاحب بھی بن جاتے ہیں جب وہ امینو ایسڈ، میتھین، لحمیات، کاربن ڈائی آکسائیڈ، امونیا وغیرہ کا تجزیہ کرتے ہیں کیونکہ یہ تمام مرکبات ارتقائی عمل کا نتیجہ ہیں۔ لہٰذا زبانی طور پر نہیں تو عملی لحاظ سے وہ ارتقاء پسند ہیں۔

جناب یحییٰ خلیہ بنانے کی ناکام کوششوں کے تذکرے میں کہتے ہیں کہ ''ایک خلیہ اس قدر پیچیدہ و مکمل ہے کہ انسان کی حاصل کردہ اعلیٰ سطح کی ٹیکنالوجی بھی اس جیسا ایک خلیہ نہیں بنا سکتی۔ ایک مصنوعی خلیہ تخلیق کرنے کی کوشش بھی آج تک کامیاب نہیں ہوسکی۔ اسی لئے اب ایسی کوششیں ترک کر دی گئی ہیں''۔ ہارون یحییٰ کا یہ کہنا تو درست ہے کہ ابھی تک مصنوعی خلیہ نہیں بن سکا۔ مگر ان کا یہ کہنا کہ ایسی کوششیں ترک کر دی گئی ہیں، یہ محض ان کی خوش فہمی ہی قرار دی جاسکتی ہے۔ کیونکہ یہ کوششیں ابھی تک بڑے زور شور سے جاری ہیں۔ ابھی چند ماہ قبل روزنامہ جنگ میں جناب ڈاکٹر عطاالرحمٰن کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں اِنکشاف کیا گیا تھا کہ خلیئے کا جی نوم (Genome) تیار ہو چکا ہے اور بہت جلد مصنوعی خلیہ معرضِ وجود میں آ جائے گا۔ پاکستان میں علمی اور سائنسی لحاظ سے ڈاکٹر صاحب کی ایک اہم حیثیت ہے۔ وہ ایک دیانتدار اور محترم شخصیت کے مالک ہیں کیونکہ دیانت داری اور نااہلیت کے لحاظ سے تقریباً آخری سطح تک گرے ہوئے معاشرے میں ان کی ذات کے حوالے سے کوئی سکینڈل سامنے نہیں آیا۔ وزارت سائنس وٹیکنالوجی کے مشیر کی حیثیت سے انہوں نے اعلیٰ تعلیم کی ترقی اور تعلیمی اداروں کو مضبوط بنانے کے لئے ان تھک جدوجہد کی۔ مسلم ممالک میں جدید علوم اور ٹیکنالوجی کے حصول کے لئے انہوں نے اسلام آباد میں مسلمان حکمرانوں کی ایک میٹنگ بھی منعقد کرائی تھی یہ یقیناً ایک انقلابی

اقدام تھا لیکن ہمارے حکمران اس کی اہمیت کا ادراک نہ کر سکے اور ان کی عدم دلچسپی کی وجہ سے یہ منصوبہ ابتدا میں ہی دم توڑ گیا۔ ہمارا تو عقیدہ ہے کہ ڈگری چاہے اصلی ہو یا جعلی' ڈگری' ڈگری ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ڈاکٹر صاحب نے پانی سے گاڑی چلانے کے دعوے کو فراڈ قرار دیا تھا۔ اب انہوں نے اس دعوے سے بہت ہی بڑے دعوے کو تسلیم کرتے ہوئے مصنوعی خلیئے کی تیاری کی نوید سنائی ہے تو ان کے پاس ضرور اس کی کوئی علمی اور سائنسی دلیل ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس دلیل تک میری رسائی ناممکن ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی بات قیاس آرائیوں پر نہیں' ٹھوس حقائق پر مبنی ہوتی ہے۔ علمی لحاظ سے میری یہ حیثیت نہیں کہ میں اس بحث میں کچھ کہہ سکوں۔ میری صرف اتنی عرض ہے کہ محترم ڈاکٹر صاحب کی طرح بڑے بڑے سائنسدانوں اور علمائے حیاتیات نے خلیئے کی ہیت کو جتنا مشکل اور پیچیدہ ظاہر کیا ہے' میرا خیال ہے کہ انسانی استدلالی علم ابھی اس سطح تک نہیں پہنچا جہاں یہ مصنوعی خلیئے کی تخلیق کر سکے۔ اگر انسان کے لئے ممکن ہو تب بھی اس تخلیق کے لئے اسے مدتوں انتظار کرنا ہوگا۔ یقیناً یہ دریافت اتنی معمولی یا غیر اہم نہیں ہوگی کہ ڈاکٹر صاحب جیسے دانشوروں یا جنگ اخبار کے ایک کالم تک محدود رہے۔ اس معاملے میں اُمید کی ایک جھلک بھی سامنے آ گئی تو اس کی دریافت سے برسوں پہلے عالمی میڈیا پر اس کے چرچے شروع ہو جائیں گے۔ نوع انسانی کی تاریخ میں یہ سب سے بڑی ''بریکنگ نیوز'' ہوگی۔ ابھی پچاس سال قبل انسان کے چاند پر قدم رکھنے اور ایک سال پہلے گاڈ پارٹیکل کی دریافت پر پوری دنیا یہ مظاہرہ دیکھ چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا غلبہ اقتدار بھی لامتناہی (Infinite) ہے اور اس کا علم بھی لامتناہی ہے۔ مگر یہ علم و اقتدار دھونس و دھاندلی پر نہیں بلکہ سراسر حکمت پر مبنی ہے 40:8 اسی نے انسان کو ضرورت کے مطابق حصولِ علم کی صلاحیت اور ذرائع عطا کئے ہیں۔ انسان ان خداداد صلاحیتوں کی نشوونما کر کے اشیائے کائنات کو مسخر کر رہا ہے مگر وہ ان صلاحیتوں کی حدود سے باہر جا ہی نہیں سکتا۔ وہ کوئی ایسی دریافت یا تخلیق کر ہی نہیں سکتا جس کی اسے صلاحیت حاصل نہیں۔ اگر انسان نے مصنوعی خلیہ بنا لیا تو واضح ہو جائے گا کہ اسے ایسا کرنے کی صلاحیت اللہ نے دی ہوئی ہے۔ اس میں حیرانی یا تعجب کی کون سی بات ہے؟ آخر اس سے پہلے بھی انسان انہی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر بڑی بڑی دریافتیں کرتا رہا ہے۔ انسانی علم محدود ہے اور اللہ کا علم لامحدود اس لئے انسان کو اللہ کے علم و اقتدار کا موازنہ اپنے علم اور اقتدار سے نہیں کرنا چاہئے۔ ایسا کرنے سے انسان خود اپنے لئے ڈر۔ خوف اور خدشات کے مواقع پیدا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ''جوں جوں انفس و آفاق (خارجی کائنات اور انسان کی داخلی نفسیاتی زندگی) میں پوشیدہ حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ قرآنی دعوؤں کی حقیقت اور صداقت نکھر کر سامنے آتی جائے گی 41:53۔ اور اس معاملے میں تو خلیئے کی تخلیق سے پہلے ہی قرآن کے اِس دعوے کی حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے کہ کائنات میں کوئی چیز بھی اتفاقیہ طور پر خود بخود وجود میں نہیں آ سکتی بلکہ اس کے لئے علم' وقت' شعور اور خالق کی موجودگی لازمی امر ہے۔ مصنوعی خلیے کی تخلیق ہو جائے یا نہ ہو سکے انسان اس حقیقت کا علمی مشاہدہ کر چکا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآنی تعلیمات پر ایمان رکھنے والے ان قرآنی حقائق کو علمی تحقیق اور عقلی استدلال کی بنیاد پر مبنی مضبوط دلائل سے پیش کریں۔ نہ یہ کہ اپنی لاعلمی یا کم علمی کے باعث خوفزدہ اور بے بس ہو کر کسی کونے کھدرے میں دبک جائیں۔ اللہ

تعالیٰ کے قانون مکافاتِ عمل کے سامنے انسان کو اپنے حواس کا جواب دہ ہونا پڑے گا 17:36 ڈاکٹر صاحب نے جینوم (Genome) کا ذکر کیا ہے۔ ایرک لینڈر کے مطابق جینوم انسانی جسم کے کیمیائی اجزاء کی فہرست ہے۔ لیکن برائسن جینوم کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''جینز کے بارے میں کافی کچھ لکھا جاچکا ہے اور ان پر گذشتہ چند سالوں میں بہت تحقیق ہوئی ہے۔ دراصل مشترکہ انسانی جینوم یا نقشے نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ ہر ایک کا جینیاتی نقشہ مختلف ہوتا ہے''۔ وہ مزید لکھتے ہیں۔ ''انسان حیرت انگیز حد تک مشابہ ہیں اگر آپ اپنے جینز کا موازنہ کسی دوسرے فرد کے جینز سے کریں تو ان میں 99.9% مماثلت ہوتی ہے''۔ اور یہی معاملہ جینوم کا ہے۔ کہتے ہیں ''بلکہ اصلیت تو یہ ہے کہ ہمارا کوئی انسانی جینوم ہے ہی نہیں ہمارے پاس چھ بلین جینوم ہیں۔ ہم سب 99.9% متماثل ہیں۔ لیکن بائیوکیمسٹ ڈیوڈ کاکس کے بقول ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم میں کوئی قدر بھی مشترک نہیں''۔

برصغیر پاک و ہند میں قصہ قدیم وجدید کی بھی خاصی اہمیت رہی ہے۔ ان کے درمیان اختلاف ومخالفت اپنی جگہ' مگر حقیقت یہی ہے کہ قومی صلاحیتوں اور قوم کی حقیقی خوبیوں کا صحیح اندازہ لگانے اور ان کی پائیدار ترقی کے لئے ضروری ہے کہ نہ ہی قدیم سے بالکل رشتہ توڑ کر اسے یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔ اور نہ ہی جدید سے بے توجہی برت کر مستقبل کی ترقی اور نشوونما کا راستہ بند کر دیا جائے۔ برصغیر پاک و ہند میں اس معتدل فکر ونظر کو پھیلانے میں سرسیّد احمد خانؒ نے اہم کردار ادا کیا۔ بے شمار رکاوٹوں' اذیتوں اور مشکلات کے باوجود اپنی ساری زندگی اس مقصد کے لئے کوشاں رہے۔ چھ کروڑ مسلمانوں میں یکجہتی پیدا کرنے' انہیں خواب غفلت سے بیدار کرنے' ان میں تعلیم کا ذوق وشوق پیدا کرنے اور ان کے حقوق کے تحفظ کے لئے ان کی جدوجہد اور دوسری طرف ہر محاذ پر ان کی مخالفت' ان کے خلاف کفر کے فتوے اور دیگر سازشوں کے انبار ایک الگ موضوع ہے۔ یہاں پر ہم نظریۂ ارتقاء کے بارے میں ان کے خیالات تک محدود رہیں گے۔ سرسیدؒ نے تفسیر القرآن لکھی تو علماء کی طرف سے اس کی سخت مخالفت کی گئی کیونکہ عام تفسیروں اور سرسیدؒ کی تفسیر میں بڑا فرق ہے۔ علامہ حالی نے تفسیر القرآن کے باون ایسے مسائل کا ذکر کیا ہے جن میں سرسیدؒ نے عام علماء سے اِختلاف کیا ہے۔ ان میں اکتالیس مسائل تو ایسے بھی ہیں جن میں علماء کبار میں سے کوئی نہ کوئی بزرگ سرسیدؒ کے ہم خیال تھے۔ بعد میں تو صورتِ حال اور بھی بدل گئی تھی۔ شیخ محمد اکرام نے عشروں پہلے لکھا تھا۔ ''آج تفسیر کو شائع ہوئے ساٹھ سال گذر چکے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض مسلمانوں نے کئی اہم مسائل میں سرسید کی رائے اختیار کر لی ہے''۔ آگے چل کر انہوں نے ناسخ ومنسوخ کے تصور سے لے کر جنوں اور بھوت پریت کے تصورات تک کئی مسائل کا ذِکر کیا ہے جنہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ''سرسیدؒ نے تفسیر قرآن میں جو طریقہ اختیار کیا تھا' اس کی کئی باتیں برصغیر پاک و ہند بلکہ دوسرے اسلامی ممالک کے علماء اختیار کر رہے ہیں''۔ (موجِ کوثر از شیخ محمد اکرام) نظریہ ارتقاء بھی انہی مسائل میں شامل ہے جس کی ابتدا میں سخت مخالفت کی گئی لیکن اب مسلمانوں کے بڑے بڑے دانشور اور علما اس کے قائل ہیں۔ سرسیدؒ نے اپنی تفسیر میں اکثر علماء کے تصور کے برعکس انسان بلکہ تمام جانداروں کی تخلیق کو کیمیائی تعامل کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ''ترکیب کیمیاوی یہ ہے کہ دو چیزیں آپس میں ایسے ملیں کہ از خود جدا نہ ہوسکیں۔ بلکہ وہ دونوں مل کر ایک تیسری چیز بن

جاوے۔ پس تراب اور طین اور صلصال اور حمأ مسنون اور ماء کی ترکیبِ کیمیاوی سے جو چیز پیدا ہوتی ہے اس سے انسان پیدا ہوا ہے۔ وہ چیز غالباً وہ ہے جو سطح آب پر جمع ہو جاتی ہے اور وہ نہ مٹی ہوتی ہے نہ ریت نہ گارہ نہ کیچڑ بلکہ ان سب کی ترکیبِ کیمیاوی سے ایک اور ہی چیز بن جاتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ اسی سے تمام جاندار انسان اور حیوان مخلوق ہوے اور یہی بات قرآن سے پائی جاتی ہے''۔ یہ ''اور چیز'' وہی خلیہ ہے جس پر پہلے بات ہو چکی ہے۔ سرسیدؒ کی اس تشریح کی نسبت ان کے اساسی نظریے کی اہمیت زیادہ ہے۔ یاد رہے کہ ڈارون کا نظریۂ ارتقا ان دنوں نیا نیا تھا اور ابھی تک برطانیہ یا یوروپ کے کچھ شہروں میں صرف علمی حلقوں تک محدود تھا۔

سرسیدؒ آیت 2:28 کے ضمن میں لکھتے ہیں ''اس آیت سے وہ ذِکر شروع ہوا ہے جو آدم کا قصہ کہلاتا ہے۔ تمام مفسرین اس کو واقعی ایک جھگڑا یا مباحثہ سمجھتے ہیں جو خدا اور فرشتوں کے درمیان ہوا' تعالیٰ شانہ عمایقولون''۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے مفسرین نے ''اسرائیلیات'' سے متاثر ہو کر قرآن کی ان آیات کی تشریح کی ہے۔ ورنہ ''آدم سے وہ ذاتِ خاص مراد نہیں جس کو عوام الناس اور مسجد کے مُلّا باوا آدم کہتے ہیں جب کہ اس سے مراد نوع انسانی ہے۔ جیسا کہ تفسیر کشف الاسرار میں لکھا ہے ''و ما مقصود بآدم۔ آدم واحد'' اور خدا نے فرمایا ہے کہ ہم نے تم کو (کُم) پیدا کیا' بنایا سنوارا اور فرشتوں کو کہا کہ آدم کو سجدہ کرو 7:11۔ پس کم کا خطاب انسانوں کی طرف ہے اور آدم سے بنی آدم یعنی نوع انسانی مراد ہے۔ وہ مزید فرماتے ہیں ''یہ ایک عمدہ اور دلچسپ بیان فطرت انسانی کا ہے' مگر عام لوگ رازِ فطرت سمجھنے سے قاصر تھے اس لئے خدا نے ابتدا میں اس راز کو ایک دلچسپ قصہ کے پیرائے میں بیان کیا ہے جو ہر ایک سمجھ سکتا ہے''۔ انہوں نے علم آدم۔۔۔۔ کے بارے میں بیضاوی اور کشف الاسرار کے حوالوں سے کہا ہے کہ ''اس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ نے انسان میں ایسے قویٰ رکھے ہیں جن سے وہ ہر چیز کو سمجھ سکتا ہے''۔ شیطان دراصل ''انسان میں جو قوتِ وہمیہ ہے وہی ابلیس کی ذریات ہیں۔۔۔ بلکہ نفس امارہ جو انسان میں ہے وہی ذریاتِ ابلیس ہے۔۔۔ غرض یہ کہ تمام محققین اس بات کے قائل ہیں کہ انسان کے انہی قویٰ کو جنہیں نفسِ عمارہ یا قوائے بہیمیہ کہتے ہیں یہی شیطان ہے''۔ ارتقاء کے بارے میں پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ موجودہ انسان جسمانی لحاظ سے فانی ہونے کے باوجود ذات کے لحاظ سے غیر فانی ہے اور اپنی نشوونما یافتہ ذات کے طفیل انسان موت کے بعد بھی ارتقائی مراحل طے کرتا رہے گا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عبدالحق کہتے ہیں:۔

'After the death of the body, all the material goods necessory for the earthly life will be left behind and only the 'Self' which will have developed and reached its spiritual evolution, will advance towards further stages of evolutionary life."

☆.....☆.....☆

سانحۂ اِرتحال

نہایت دُکھ کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ بزمِ طلوعِ اسلام کوئٹہ کے دیرینہ رُکن محترم عبدالغفور محسن مورخہ 17 دسمبر 2013ء کو 87 سال کی عمر میں اس دارفانی سے رحلت فرما گئے ہیں۔

مرحوم کی بزم کوئٹہ سے رفاقت قدیمی تھی اور وہ گاہے بہ گاہے ماہنامہ طلوعِ اِسلام کے لئے بھی لکھتے رہے۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت عطا کرے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل سے نوازے۔ ادارہ مرحوم کے تمام لواحقین، اعزہ واقربا اور بزم کوئٹہ کے اراکین کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

قائم مقام چیئرمین ادارہ

محمد اکرم راٹھور

☆.....☆.....☆

بہت دُکھ کے ساتھ یہ اندوہناک خبر دی جاتی ہے کہ بزم طلوع اسلام کوئٹہ کے دیرینہ ساتھی اور تاحیات ممبر عبدالغفور محسن مورخہ 17 دسمبر 2013ء کو اس دارفانی سے رحلت کر گئے ہیں۔

مرحوم ہمہ صفت علمی شخصیت کے مالک تھے۔ قرآنی تشریحات اور تاریخ کے حوالے سے ہماری رہنمائی ہمہ وقت کرتے رہے۔ مرحوم کو غلام احمد پرویزؒ نے کاتبِ بزمِ طلوع اسلام کوئٹہ کا خطاب بھی دے رکھا تھا۔ بزم کوئٹہ کی طرف مالی تعاون کرتے رہے۔ حتیٰ کہ ان کے فرزند ارجمند جو ناروے میں سکونت پذیر تھے نے بزم کوئٹہ کی زبوں حالی کو دیکھتے ہوئے وہاں سے ایک خطیر رقم کتب کی خریداری کے لئے بزم کوئٹہ کو عنایت کی جس کے لئے بزم کوئٹہ ہمیشہ ان کی احسان مند رہے گی۔

تمام بزمِ ہائے طلوع اسلام سے استدعا ہے کہ مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت اور پسماندگان کے لئے صبرِ جمیل کی دُعاؤں میں یاد رکھیں۔ شکریہ

فقط

ہومیوڈاکٹر غلام صابر

نمائندہ بزم طلوع اسلام کوئٹہ

حسن جعفر

دینی اور دنیوی تعلیم! آج کا تقاضا کیا ہے؟

چند برس پیشتر جب میرا بڑا بیٹا عدیل انقرہ (ترکی) کی مڈل ایسٹ ٹیکنیکل یونیورسٹی (METU) میں تعلیم مکمل کر رہا تھا' اس نے وہیں کی ایک لڑکی سے شادی کا فیصلہ کرلیا۔ وہ بھی METU سے کیمیکل انجینئرنگ کی گریجویٹ تھی۔ لڑکی کے ماں باپ راضی ہوگئے تو ہم بھی راضی ہوگئے۔ میں اپنی بیگم اور دوسرے بیٹے کے ہمراہ انقرہ پہنچ گیا۔ میرے دو بھائی اور بھتیجی بھی اپنے شوہر کے ہمراہ وہاں پہنچ گئے اور یوں ایک چھوٹی سی بارات بن گئی۔ ترکی کے قانون کے مطابق لڑکی اور لڑکا شادی رجسٹرار کے دفتر گئے اور جج کے سامنے مطلوبہ دستاویزات پر دستخط کرنے کے بعد قانوناً میاں بیوی قرار دے دیئے گئے۔ اگر کوئی اپنے دینی تقاضے پورے کرنے کے لیے چاہے تو نجی طور پر نکاح کا اہتمام کرسکتا ہے جسے ''دینی نکاح'' کہا جاتا ہے۔ ہم نے لڑکی والوں سے کہا کہ ہو سکے تو اس کا اہتمام بھی کرلیں۔ وہ تیار ہوگئے۔ ترکی میں مولوی یا مولانا کو ''ہوجا'' کہتے ہیں۔ دوپہر کو ہمارے سمدھی صاحب نے ہمیں اپنے ہاں لنچ پر بلالیا کہ اس موقع پر دینی نکاح کی رسم بھی انجام پاجائے گی۔ چنانچہ ہم اپنے مختصر باراتیوں کے ساتھ وقت مقررہ پر ان کے ہاں پہنچ گئے۔ ڈرائنگ روم میں ان کے چند قریبی رشتہ دار موجود تھے۔ ان کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے جب خاصا وقت گزر گیا تو میں نے اپنے سمدھی سے پوچھا کہ ہوجا ابھی نہیں آئے۔ اُن سے کہیں کہ وہ جلد آجائیں تاکہ ہم یہ نیک کام انجام دے کر فارغ ہوجائیں۔ ہمارے سمدھی مسکرائے اور دور ایک صوفے پر بیٹھے ہوئے سوٹ ٹائی میں ملبوس' کلین شیو' 25 یا 26 سال کے خوبرو نوجوان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ ہوجا بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہم سب کے لیے یہ ایک دلچسپ اور خوشگوار حیرت تھی۔ ہم نوجوان ہوجا سے اٹھ کر ملے اور انہیں اپنے قریب بٹھا کر حال احوال دریافت کیا۔ ہوجا اچھی انگریزی بولتا تھا حالانکہ ترکی میں پڑھے لکھے لوگ بھی روانی سے انگریزی نہیں بول پاتے کہ ان کی سرکاری زبان ترکی ہے اور زیادہ تر ذریعہ تعلیم بھی ترکی زبان ہے۔

میں نے پوچھا کہ آپ کس دینی مدرسہ کے فارغ التحصیل ہیں؟ ہوجا نے کہا ہمارے ہاں دینی مدارس نہیں ہوتے۔ ہم سب ایک ہی سکول سسٹم میں تعلیم پاتے ہیں۔ پہلی سے بارھویں (12 اگریڈ) تک اس سکول سسٹم میں زبان' ادب' ریاضی' سائنس'

تاریخ، جغرافیہ اور معلومات عامہ پڑھائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد جب یونیورسٹی تعلیم شروع ہوتی ہے اور آپ چار سالہ بیچلر گریجوایشن کورس میں داخلہ لیتے ہیں تو تب آپ اسلامیات یا علوم دینی کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہاں آپ تفصیل سے فقہ، حدیث، تفسیر اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد آپ ماسٹرز بھی کر سکتے ہیں۔ نوجوان ہوجانے بتایا کہ اس نے حال ہی میں انقرہ یونیورسٹی سے اسلامیات میں ماسٹرز کیا ہے اور اسے شہر کی ایک مسجد میں خطیب کی حیثیت سے ملازمت مل گئی ہے۔ اسے تمام فقہی علوم پر عبور حاصل ہے اور وہ ہر فقہ کا نکاح پڑھ سکتا ہے۔ ہوجانے ہماری فقہ دریافت کرنے کے بعد بڑی عمدہ قرأت میں عربی میں نکاح پڑھایا اور پھر ترکی زبان میں چھوٹی سی تقریر کے بعد دعا منگوائی اور یہ رسم اختتام پذیر ہوئی۔

ترکی اور ملائشیا دونوں سیکولر ملک ہیں جہاں مذہب کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نظام تعلیم میں مدرسہ کلچر نہیں جو تنگ نظر فرقہ واریت اور مذہبی انتہا پسندی پھیلا کر معاشرے کی ترقی میں بہت بڑا پتھر بن کر کھڑا ہوجاتا ہے۔ ہمارے ہاں ترکی کے دو حوالے پائے جاتے ہیں۔ ایک تحریک خلافت تھی جس کے ذریعہ خلافت عثمانیہ کو بچانے کی کوشش کی جارہی تھی اور ایک مرحلے پر احراریوں نے اس تحریک کی قیادت مہاتما گاندھی کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ دوسرا حوالہ قائداعظم کا ہے جو اس تحریک سے دور رہے۔ ایک مرتبہ قائداعظم کی بیٹی نے اپنے مطالعہ کے لئے کتاب تجویز کرنے کی درخواست کی تو انہوں نے اتاترک کی سوانح عمری Grey Wolf پڑھنے کی تلقین کی۔ آپ نے اتاترک کے انتقال پر مسلم لیگ کے 1938ء کے سالانہ اجلاس میں بیان میں فرمایا تھا کہ کمال اتاترک کی شکل میں اسلامی دنیا نے ایک عظیم ہیرو کھو دیا ہے۔ اس عظیم مسلمان کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے کیا ہندوستان کے مسلمان اب بھی دلدل میں پھنسے رہیں گے؟ اور سامعین نے جواب دیا تھا ''نہیں نہیں''۔ ترکی کے اس عظیم مسلمان نے مولویوں کے غلبہ سے ترکی کو آزاد کروا کر جدید ترکی کی بنیاد رکھی جو آج مسلم ممالک میں سب سے زیادہ صنعتی اور ترقی یافتہ ملک ہے۔ ہمیں سوچنا ہے کہ کیا ہمیں اپنے محبوب قائداعظم کی تقلید کرنی ہے یا کسی اور کی۔

مسلمانوں میں دنیوی اور سائنسی علوم کے حصول کا سلسلہ عباسی دور میں شروع ہوا جب بغداد میں دارالحکمت قائم ہوا جس میں غیر مسلم عجمی دنیا یعنی روم، بازنطین، یونان، ہندوستان اور چین تک سے کتابیں منگوا کر ان کے تراجم کرائے گئے اور آزادانہ تحقیق (Free Inquiry) کی تحریک نے تقویت پکڑی جسے معتزلہ کہا جاتا تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی سے گیارہویں صدی تک اس تحریک کو عروج حاصل رہا اور جو بڑے بڑے نام سائنس، ریاضی اور حکمت میں لیے جاتے ہیں وہ اسی تحریک سے وابستہ تھے اور اسی دور میں پیدا ہوئے۔ الخوارزمی، جابر بن حیان، الکندی، الفارابی، الرازی، ابن الہیثم، ابن سینا، الزہراوی، البیرونی، الکرجی، المسعودی

اور عمر خیام چند اہم نام ہیں جن پر ہمارے ہاں بہت فخر کیا جاتا ہے۔ سلجوقی عہد کے سلطان ملک شاہ کے وزیر نظام الملک طوسی نے 1080ء میں بغداد میں بقول ابن خلدون فقیہوں کا پہلا مدرسہ قائم کیا جہاں صرف فقہ، حدیث اور تفسیر کی تعلیم دی جاتی تھی۔ عباسی عہد کے آخری سلاطین کے عہد میں معتزلہ تحریک کا قلع قمع کیا جا چکا تھا۔ آزادانہ تحقیق کی جگہ اندھی تقلید نے لے لی تھی۔ صرف دینی علوم کو علوم قرار دیا گیا، باقی تمام علوم کو کفر قرار دے دیا گیا۔ کیمیا دان اور فلسفی کے الفاظ ملحد و زندیق کے ہم معنی قرار دے دیئے گئے۔ یہاں سے وہ دور شروع ہوا جس میں کوئی قابل ذکر سائنسدان پیدا نہ ہوا۔ جگہ جگہ مدارس نظامیہ قائم ہوتے گئے اور جب بارہویں صدی میں مسلمان برصغیر میں حکمران ہوئے تو یہی سلسلۂ نظامیہ یہاں بھی رائج ہوا۔ صرف اندلس میں یہ سلسلہ نہ پہنچا کیونکہ وہ بغداد کے مکتبہ فکر کے زیر اثر نہیں تھا۔ اس لیے وہاں سائنسی علوم کا سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا اور ابن باجہ، ابن ظہور، ابن طفیل اور ابن رشد پیدا ہوئے۔ مگر غرناطہ کے زوال سے پہلے وہاں بھی کیمیا اور سائنس اور فلسفہ پر کام کرنے والوں کو ملحد و زندیق گردانا جانے لگا تھا۔ مقری کے بقول لوگ انہیں کافر گردان کر پتھر مارتے تھے۔ اندلس میں مسلمانوں کے زوال کا ایک سبب یہ بھی تھا۔

ہمارے ہاں کا دینی مدرسہ گیارہویں صدی کے درس نظامیہ کا تسلسل ہے۔ اس کے نصاب میں بھی بہت کم تبدیلی کی گئی ہے۔ ہم نے جامعۃ الازہر مصر سے بھی کوئی سبق نہیں لیا کہ وہاں میڈیکل اور انجینئرنگ کی فیکلٹیز بھی شامل ہیں۔ ہمارے ہاں ہونا یہ چاہئے تھا کہ دینی مدارس کو Mainstream سکول سسٹم کا حصہ بنا دیا جاتا جیسا کہ ترکی میں ہے اور پھر یونیورسٹی سطح پر جس کا دل چاہتا وہ دینی علوم کی گریجوایشن کرتا۔ لیکن ہوا اس کے برعکس۔ ہم نے اس سکول سسٹم کو جو 47ء میں برطانوی عہد سے ورثہ میں ملا تھا اور سرسید، اقبال اور قائداعظم اس کی مزید ترقی و ترویج چاہتے تھے، ہم نے اس کو بھی دینی مدرسہ میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ اسلامیات کے مضمون کے علاوہ اردو، انگریزی اور دیگر سائنسی مضامین کی نصابی کتابوں کو بھی زیادہ سے زیادہ مشرف بہ اسلام کرنے کی کوشش کی گئی۔ حالانکہ ہمارے گھروں میں دینی تعلیم دی جاتی ہے، جمعہ کے خطبات اور دینی اجتماعات بذات خود ایک دینی درسگاہ کا کام کرتے ہیں۔ حال میں پنجاب ٹیکسٹ بورڈ نے نصابی کتب میں تبدیلی کر کے درسی نصاب کو عصر حاضر سے ہم آہنگ کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ خوش آئند ہے۔ اگر ہمیں 21ویں صدی میں زندہ رہنا ہے تو اس تبدیلی کو برقرار رکھنا چاہئے۔

(بشکریہ روزنامہ دنیا)

☆.....☆.....☆

بنجر پاکستان میں، باغبانی اور جنگل کاری

☆ باغبان ایسوسی ایشن کا ماٹو ''قرآن فہمی اور باغبانی'' ہے

☆ 2014ء مری میں باغبانی کی 101 ویں سالگرہ ہے

☆ پاکستان بھر کے باغبانوں، زرعی اداروں، زرعی یونیورسٹیوں اور پورے پاکستان کے محکمہ جنگلات اور محکمہ ماحولیات کے دانشور خواتین وحضرات سے پرزور اپیل کی جاتی ہے کہ وہ 2014ء کو

''بنجر پاکستان میں باغبانی اور جنگل کاری'' کے طور پر منائیں اس سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوں گے۔

☆ بنجر پاکستان آباد ہوگا

☆ بنجر پاکستان میں باغبانی ہوگی

☆ بنجر پاکستان میں جنگل کاری ہوگی

☆ روزگار کے مواقع پیدا ہوں گے

☆ غربت کے خاتمہ میں مدد ملے گی

☆ ماحولیات کے لئے یہ سال بطور خاص اہمیت حاصل کرے گا

☆ جہاں مری کے باغبان اپنی 101 ویں سالگرہ منائیں گے وہاں پورے پاکستان کا ساتھ دیتے ہوئے 2014ء کو باغبانی اور جنگل کاری کے طور پر منائیں گے

☆ 100 سالہ پودہ جات میں مری کا آملہ۔ دیسی انار۔ ناکھ ناشپاتی۔ اخروٹ۔ ہاڑی۔ شہتوت۔ بٹنگی۔ پھگواڑی اور ریٹھا کے پودے شامل ہیں۔ لاہور چڑیا گھر کا برگد کا درخت سو سالہ ہے۔ دیگر معلومات درکار ہیں۔

پتہ / رابطہ

(1) ملک حنیف وجدآنی صدر باغبان ایسوسی ایشن سنبل سیّداں نیو مری

(2) صبینہ یاسمین سینئر نائب صدر باغبان ایسوسی ایشن ٹبی سیّداں سوہاوہ جہلم

(3) تنویر صادق نائب صدر باغبان ایسوسی ایشن میاں چنوں خانیوال

(4) ڈاکٹر حامد حسین نائب صدر باغبان ایسوسی ایشن بلاک C ڈیرہ غازی خان

(5) طارق ایم ملک شعبۂ نشتر واشاعت باغبان ایسوسی ایشن چارہان نیو مری

(6) احمد نواز خان تاحیات ممبر باغبان ایسوسی ایشن گاؤں گھماواں نوانشہر ایبٹ آباد

سلیم صافی

مذہب کے نام پر خونریزی کا تدارک..... کیوں اور کیسے؟

مذہب انسانوں کو جوڑتا ہے لیکن اس کو صحیح معنوں میں اپنانے کے بجائے اگر ذاتی، سیاسی یا نسلی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے تو وہ انہیں توڑنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ہمارا دین سلامتی کا دین اور امن کا راستہ ہے لیکن اگر اسے مذکورہ مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے تو خونریزی کا موجب بن جاتا ہے۔

محترم افتخار عارف صاحب نے اس صورتحال کو ایک شعر میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ یوں بیان کیا کہ:

رحمتِ سیدِ لولاک صلی ﷺ پہ کامل ایمان
امتِ سیدِ لولاک صلی ﷺ سے خوف آتا ہے

بدقسمتی سے برصغیر اور پاکستان میں مذہب کا یہ استعمال سالوں سے بدرجہ اتم جاری ہے۔ بعض پاکستانیوں کے لئے یہ وسیلۂ روزگار ہے۔ بعض کے لئے یہ شہرت اور اختیار کمانے کا ذریعہ ہے۔ بعض اس کے ذریعے اپنا رعب بٹھاتے ہیں تو بعض نے اسے اپنے سیاسی اور نظریاتی مخالفین کی زبان بندی کا ہتھیار بنالیا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو سے لے کر جنرل ضیاء الحق تک اور مذہبی سیاسی جماعتوں سے لے کر فرقہ پرست اور مسلکی جماعتوں تک، نہایت بیدردی اور سفاکی کے ساتھ مذہب کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا گیا اور جارہا ہے۔ کسی شاعر نے اس صورت حال کا نقشہ کچھ یوں کھینچا ہے کہ:

ذہنوں میں ان کے بت ہیں عقائد کے نام پر
کہتے ہیں اپنے آپ کو جو لوگ خدا پرست

پاکستان اسلام کے نام پر بنا لیکن یہ مقدس دین سب سے زیادہ اس ملک میں مظلوم ہے۔ یہاں قرآن فریادی ہے اور کسی نے اس کے ساتھ ہمارے سلوک کو ملاحظہ کرنا ہو تو ماہر القادری کی نظم ''قرآن کی فریاد'' ملاحظہ کرلیں۔ یہاں شریعت کے لفظ کا سب سے زیادہ تذکرہ ہوتا ہے لیکن ہماری اجتماعی زندگی میں شریعت کہیں نظر نہیں آتی۔ جس کی وجہ سے یہاں اسلام کے نام پر بننے والا عالمِ اسلام کی ''امیدوں کا یہ مرکز'' دہشتستان بن گیا ہے۔ یہاں مسجد محفوظ ہے اور نہ امام بارگاہ، یہاں عالم کو جینے کا حق دیا جاتا ہے اور نہ فنونِ لطیفہ سے وابستہ صاحبانِ فن کو۔ مسلمان مسلمان کو مار رہا ہے۔ کفر اور ارتداد کے فتوؤں کی اس قدر بھرمار ہے کہ ہر کوئی دوسرے کے ایمان کے

بارے میں شک میں مبتلا ہوگیا ہے۔اس ملک میں آج دین کے بنیادی احکامات اور مسلمان کے بارے میں بھی کنفیوژن بڑھ گیا ہے۔ باوجود اس کے کہ یہاں پر اسلامی نظریاتی کونسل بھی موجود ہے اور وفاقی شرعی عدالت بھی' دین سے متعلق بنیادی سوالات کا جواب دینے سے ریاست گریزاں ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل یہاں پر سیاسی رشوت کا ذریعہ بن گئی ہے جب کہ وفاقی شرعی عدالت سے رجوع کیا جارہا ہے اور نہ اس کے فیصلوں پر من وعن عمل ہورہا ہے۔اس لئے گزارش کی جاتی ہے کہ اگر میاں نواز شریف کی حکومت واقعی اس ملک کو امن وخوشحالی کی راہ پر گامزن کرنا اور حقیقی معنوں میں مسلمانوں کا ملک بنانا چاہتی ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلی فرصت میں میرٹ کی بنیاد پر اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل نو کرے۔اس میں تمام مسالک کی نمائندہ شخصیات کو آبادی کے تناسب سے نمائندگی دے پھر اسلامی نظریاتی کونسل خود فیصلہ ساز فورم نہ بنے بلکہ وہ داعی بن کر ایک بڑا فورم تشکیل دے دے۔اس فورم میں تمام مذہبی' سیاسی اور مسلکی جماعتوں کے نظریاتی اور علمی قسم کے نمائندوں کو مدعو کرے۔اس میں تحریک طالبان پاکستان اور اسی نوع کی دیگر تنظیموں کے حامی علماء کو بھی بلا لیا جائے۔

پاکستان کی اقلیتوں کے نمائندوں کو بھی مدعو کیا جائے۔اس فورم کی سطح پر آزادانہ مگر خفیہ مکالمہ ہو۔اسی طرح کا مکالمہ جس طرح کہ اٹھارویں آئینی ترمیم کی تیاری کے لئے پارلیمانی کمیٹی نے کیا تھا۔جب تک حتمی سفارشات تیار نہ ہوں تب تک نہ یہ لوگ میڈیا میں آئیں نہ وہاں سے نکلنے والی خبروں کو میڈیا میں ڈسکس کیا جائے۔وہاں سے جو اصول' سفارشات اور قواعد وضوابط منظور ہوجائیں' ان پر تمام شرکاء سے دستخط لئے جائیں۔پھر ان سفارشات کو اسلامی نظریاتی کونسل اپنی سفارشات کی شکل میں منظور کرکے پارلیمنٹ کو بھجوادے اور پارلیمنٹ ان کی بنیاد پر قانون سازی کرے۔

اس مجوزہ وسیع علمی اور مذہبی فورم کے سامنے جو سوالات رکھے جائیں' ان میں چند نمونے کے سوالات یہ ہوسکتے ہیں کہ فتویٰ دینے کا اختیار کس کے پاس ہونا چاہئے؟' ریاستی اختیار کے بغیر جو لوگ کسی کو کافر یا مرتد قرار دے دیں' اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ شہید کون ہے اور ہلاک کون ہے؟ اُمت کے تصور کے تقاضے کیا ہیں اور پاکستانی ریاست کا شہری ہونے سے کیا فرائض عائد ہوتے ہیں؟ کیا مسلک اور فقہ کی بنیاد پر سیاست کی اجازت ہونی چاہئے یا نہیں؟ کس حد تک پاکستانی ریاست اور اس کی حکومت کی اطاعت جائز ہے اور کہاں پر بغاوت جائز یا فرض ہوجاتی ہے' وغیرہ وغیرہ۔اسی طرح یہ فورم لاؤڈ اسپیکر کے استعمال' مدارس کے نصاب' مساجد کے انتظام اور اسی نوع کی دیگر چیزوں سے متعلق بھی ضابطہ اخلاق وضع کرے۔فرقہ وارانہ لٹریچر اور تقاریر سے متعلق اصول وقواعد بھی یہ فورم وضع کرے۔پاکستان جیسے ملک میں تو شاید جمعہ کے خطبہ کا اختیار ریاست کو دینا مشکل ہو لیکن ابتدائی طور پر اگر یہی فورم سال بھر کے لئے خطبے لکھ کر خطیبوں کے حوالے کردے تو بہت اچھا ہوگا۔یہ کمیٹی رمضان المبارک' محرم اور ربیع الاول جیسی مذہبی تقریبات کو منانے کے

لئے بھی اصول وضوابط وضع کرے۔ یہ چند نمونے کے سوالات تھے اور چند نمونے کی تجاویز ہیں لیکن پارلیمنٹ یا کوئی اور فورم اس طرح کے سوالات اور تجاویز کو مربوط اور جامع شکل میں اسلامی نظریاتی کونسل اور اس کے ذریعے اس وسیع فورم کے سامنے رکھ سکتی ہے۔

☆.....☆.....☆

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزم طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-	سورہ یٰسین	(36)	164	150/-
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	----	سورہ الصفٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورۃ الکہف وسورہ مریم	(18-19)	532	400/-	سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ الحج	(22)	380	350/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-
سورۃ النور	(24)	264	350/-				
سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-				

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)، 25/B، گلبرگ 2، لاہور، فون نمبر: 4546 3571-42-92+

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

قرآنک فاؤنڈیشن

والا اشتہار لگانا ہے

Surah *Al-Muddaththir* (الْمُدَّثِّرُ)– Durus-al-Qur'an Parah 29: Chapter 21

By G. A. Parwez

(Translated by: Dr. Mansoor Alam)

My dear friends! Today is February 24, 1984 and today's lecture starts with verse 27 of Surah *Al-Muddaththir* (الْمُدَّثِّرُ).

The focus in the past verses

In the previous verses a dramatic scene was presented thus: a representative of the capitalist system came; he was presented with explanation and logic of the truth of the universal system of sustenance of all humankind compared to his false capitalistic system; he pondered over this; he arrived at a conclusion; how he was rebuked for arriving at the wrong decision; then how he pondered over it again and again and chose the wrong decision yet again; and how he arrogantly walked away mocking at the Prophet (PBUH) and saying that this was the same old lie as from the past warning of destruction that you will go to Hell. This capitalist representative went on: this claim of the Prophet (PBUH) that this message is from God is false; and that the Prophet (PBUH) is making it up himself as a scare tactic – إِنْ هٰذَآ إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (74:25) – This is nothing but the word of mortal man!

Our wrong idea about Hell

Dear friends! The Quran said *this* in just two words: سَأُصْلِيهِ سَقَرَ (74:26). Before we get to the true meaning of this verse let us consider our traditional translation of the Arabic words "جَهَنَّمَ" "جَحِيم" or "سَقَرَ" which is done as hell. And our concept of hell is that it will happen in the Hereafter after the Day of Judgment; that it is not concerned with our life here in this world; and that the result of our actions will not appear in this world but will only appear in the Hereafter. Obviously, we all believe in the Heaven and Hell of the Hereafter and that is the greater part of our faith. But it is our mistake to put all the results of our bad actions to the Hereafter exclusively. According to the Quran the results of our bad actions start here in this world. It says that the result of right action done in accordance with the Quran starts as a heavenly life here in this world or starts as a life of hell otherwise.

The Quran has used the words "جَهَنَّمَ" "جَحِيم" or "سَقَرَ" as terms in relation to the life of

this world as well. In reality, life moves in continuous order from here, in this world, without any breaks to the Hereafter. If life of this world is hell then the life of the Hereafter is also hell. The Quran says that humans carry the fire themselves to the Hell. The traditional translation of the above verse سَأُصْلِيهِ سَقَرَ (74:26) is: Soon will I cast him into Hell-Fire! And as I said a moment ago our concept of Hell is that it will come after life after death, not during the life here. As I have said we all believe in the life of the Hereafter and its Hell and Heaven; but it is wrong to associate them only with the Hereafter because the Quran uses the letter "سَ" which means "soon". Another point to note is that the enemies of the Prophet (PBUH) did not believe in the Day of Judgment or in the Hell of the Hereafter. Then to tell them that after death you will be punished in the Hereafter because of your actions was meaningless as they did not believe in them. The Prophet's goal of warning them was also not to threaten them with revenge but to warn them that they will face the consequences of their wrong actions soon, here, in this world.

Dear friends! At many places the Quran mentions the sarcastic remarks the opponents of the Prophet (PBUH) used to hurl at him such as: "Look what he is saying? He is saying that when you are dead and when your bones have decayed then you will have second life and you will face judgment and accountability?!" Obviously, those who do not believe in this would make fun about it. The goal of the Prophet (PBUH) was not to force them to accept his message but to warn them about the consequences of their wrong actions and the reality of the law of requital. But one who does not believe in accountability for his actions how can he desist from wrong behavior? He will of course resort to hurling insults and sarcasm, instead. This warning did not have any effect on the Quresh just as, strangely enough it does not have on us today. This is so because we also do not have the conviction that the law of requital is real; that it will produce results here; and, if not here, then in the Hereafter on the Day of Judgment where there will be scale and accountability and Hell. The way we live our life proves that we do not believe in them. You may be shocked what I am saying but that is the truth: (2:8) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ -- And there are people who say, "We do believe in God and the Last Day," and all the while they do not really believe. This is being told, in fact, regarding us. If we have the conviction that arsenic kills then no sane person will go near it.

How many times do we hear that we will be punished for our wrong actions; that sinners will go to Hell; that we will have to pay for every crime we commit? The

purpose being that we desist from such things. But does it work? If a sane person has conviction on the truth and reality of accountability for one's action then he would not commit sins or do bad deeds. But despite this he keeps on doing bad deeds; he does not change his behavior. This means he is non-serious; that he thinks the law of requital is just a joke; that he really does not believe in accountability for his misdeeds. My dear friends! If he had conviction about the veracity of the law of requital and its working in producing result of every action, even of every thought; then what you call sin will never happen from him if he were sane. It is another matter though if he were mad. The definition of madness is that one does not realize one's own benefit or loss in this state. So, leave such a person aside. But if a person who is physically sane and sound and keeps on doing misdeeds and sins that are hallmarks of Hell, then what is it that keeps driving him to do such things? The only thing one can conclude from this is that he does not have conviction in the accountability of the law of requital. If with sane and sound mind he had conviction that such actions would lead to destruction, then a human being would not do such things.

No lawsuit in a year: an unparalleled example

During the period of Abu Bakr (R) a post of judge was created, and Umar (R) was appointed on this post. Umar told Abu Bakr to abolish this post as no case came before this court for one year. My dear friends! How could any case come before the court? The entire society reflected the deep conviction that people had in the law of requital; in the accountability of actions and even in accountability of thoughts; in the Day of Judgment; in the Hereafter. If this level of conviction about the accountability in the Hereafter enters the heart of everyone then how could anyone be motivated to do any crime in such a society? There are thousands of items available in market that can kill people if they ingest but they don't, because they know the consequence. They know that the law of requital will kill them. But the same conviction is not there: that lying, cheating, deceiving, stealing, destroying, or oppressing will kill them just like any poison. If someone had this conviction, then he will not do such things. This is the reason the Quran says: وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ (2:8) – They do not have conviction although with their tongue they say: يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ – That we believe in Allah and the Hereafter.

Dear friends! In this verse (2:8), the Quran, by saying "يَقُولُ", has it not painted our own picture? After all, there were those who outright rejected the believe in the Hereafter. So, there was no question of them paying any attention to the warning

about accountability and judgment after death. It was a waste of time to work on them. One must remember! This warning was never meant as a threat; it was never meant to scare people into believing.

Another type of people

As I said the Quran describes a category of people who openly declare that we do not believe it. They make fun of life after death; of the law of requital. This is one category of people. The other category is of people who openly and sincerely accept the message of the Quran and act according to it. But, still, there is another category of people who play a game of double standard with those who want to establish the Quranic system of life. Sadly, this is *our* category. The Quran says about these people: يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (2:9) – They deceive Allah and those who have attained conviction - but they deceive none but themselves, and perceive it not. What the Quran has said about people like us? It has said that we deceive: not Allah; not those who have attained conviction; but ourselves. وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ (4:113) – yet none but themselves do they lead astray. He that says that arsenic does not kill, is deceiving himself; and if he goes ahead and takes it himself then kills no one but himself. Who that believes in traffic rules knows that he will be held accountable by the police if he does not follow these rules. This is called belief in the hereafter. But the Quresh did not believe in the Hereafter; in the accountability after death; or in the law of requital. So, what could prevent them from doing crimes against humanity if this was their attitude? The representative of the Quresh left the Prophet (PBUH) mocking and huffing and puffing with arrogance. The Quresh felt that nothing could shake them. But the Quran says that they will soon see the results of their actions. They are not something to be postponed until the Day of Judgment. And so it happened: سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ (74:26) – And soon the Day of accountability was there in front of them.

The Quresh could not have imagined this doom and destruction. For centuries they were leading a lawless tribal life without any organized government, without any formal state or military. They were fiercely protective of their life style and enjoyed their elite powerful status in all of Arabia. It was common place for caravans to be looted those days but no one could dare to look at their caravans with bad eyes. The Quran puts it like this: رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ (106:2) – their caravans were secure in their winter and summer journeys, i.e., all year round. They were the custodians of the Kaba. By race and tribe they enjoyed such superior status that no one could challenge

them. They were at the top of that society in terms of dignity and power. No one could rival them in commerce and business. They had never seen any bad days in their entire history. So, to tell them that you will go to Hell after you die could not prevent them from leading their life of arrogance and exploitation; could not prevent them from committing crimes against humanity. They did not believe in accountability in the Hereafter; in fact, they used to make fun of it. But soon that "سَقَرَ" came. It was not an empty threat. It was the grip of the law of requital.

The importance of the law of requital

My dear friends! The Quran has placed the foundation of Iman on the law of requital. The revelation and the chain of messengers and books from Allah – all these are meant in the final analysis for this law. What this chain of revelations that Archangel Gabriel brought to the messengers was for? This was really to tell that such and such actions will produce such and such results. If we claim to believe in all of the above and not in the law of requital then every belief becomes null and void. Without the belief in the law of requital it is meaningless to believe in Allah, in His Books, in revelation, in messengers, in angels, or in the Hereafter. If one has conviction that criminal action will never go unrecorded and unpunished, then a sane person will never do a crime; and a society composed of such individuals will be crime-free. This was the case during the period of Abu Bakr (R) as I mentioned a moment ago.

No need of police, criminal courts, or jails

My dear friends! If a nation believes and has full conviction in the law of requital then there would be no need for police, or courts, or jails. There would be no need to have these as no one would commit any crime due to deep conviction in the law of requital. But, we, on the other hand, say with our tongue that we believe in it and in the Hereafter; but, in reality, we don't: وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (2:8) – They do not have conviction although with their tongue they say: يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ – That we believe in the Allah and the Hereafter. Also: يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (2:9) – They deceive Allah and those who have attained conviction - but they deceive none but themselves, and perceive it not. The Quran says about the hypocrites: يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ (3:167) – uttering with their mouths something which was not in their hearts. Those who do not believe in "سَقَرَ" whether openly like the Quresh or people like us who say with our tongues that we believe but not in the heart, it does not matter. This is the reason we do not desist from bad actions although there is no

dearth of those who scare us with sermons about the Hell of the Hereafter. But those sermonizing do not see the hell in which they live presently:

You are talking about the hell, the heaven, and the scale of the after here

How sad! That you do not see the hell in which you presently live just here

The image of "سَأُصْلِيهِ سَقَرَ" in Mecca

What was the hell that the Quresh and their representative, in fact their entire nation, was told that soon they will see as a result of their wrong actions: سَأُصْلِيهِ سَقَرَ (74:26). This is extremely important what has been said here: The Quresh *did* see what they used to deny in their hubris; used to condemn it as a lie; used to dismiss it as a joke with contempt. But, here, they were standing before the Prophet (PBUH) in fetters and chains. Quresh's hubris was legendary and has come in our lectures several times before. The height of that hubris is illustrated by Abu Jahal's wish in the battle of Badr: to cut-off his neck from below because it will be higher than the rest during the procession afterwards. This was the extent of the hubris of the leaders of the Quresh!

Prisoners in chains reflecting pride

My dear friends! The Prophet (PBUH) was the same person that these same Quresh had driven him and his companions out of Mecca. These same Quresh wanted to kill him and his companions so much so that the Prophet (PBUH) and his companions had no choice but to seek refuge in Medina. But what happened soon thereafter? These same Quresh were standing in front of the Prophet (PBUH) in fetters and chains and were waiting for his judgment; waiting for the punishment they would receive from him. But the Quresh reflected their pride even under this situation. They did not beg for pardon. They trusted the virtuous character of the Prophet (PBUH). When he asked them what should be done to them, they said: "Do unto us what a noble brother does with rest of his brothers."

The high moral character of the Prophet (PBUH)

My dear friends! How much they trusted the nobility of this brother! And the nobility did come through when he announced: لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ (12:92) – "No reproach shall be uttered today against you." They are asking for nobility from their brother? "Open their fetters." Contrast this with the behavior of their representative who, in full hubris just recently, had mocked and made fun of the Prophet's message and walked

away making bad gesture at him. Then the Prophet had told: سَأُصْلِيهِ سَقَرَ (74:26) – soon you will see the doom and destruction of your wealth and power and your arrogance and elitism would soon disappear. The blazing fire will burn all these and turn them into ash. وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَقَرُ (74:27) – And do you know what this burning fire is and what it does? We translated سَقَر as "fire" which will happen after death in Hell. But listen: لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ (74:28) – It does not spare anything and turns everything into a heap of ash.

The last chapters of the Quran contain extremely concentrated meanings

My dear friends! What to say of the Quran! The entire Quran is a miracle. But in the last chapters this miracle has reached unprecedented levels in putting an ocean of meaning in just few words. Here it says what is سَقَرُ (74:27)? The answer: لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ (74:28) – This is such that it does not spare anyone. It engulfs everyone within itself. It will burn everything: All their hubris, all their wealth, all their power, all their elitism, etc. Nothing will remain beyond its grips. This did come to the Quresh soon. There was nothing left of their racial superiority.

The Prophet's last sermon

In the last sermon the Prophet (PBUH) is reported to have said that there is no distinction between human beings based on color (black or white) or race (Arab or non-Arab) or any other physical attributes except the distinction based on Taqwa. "All these distinctions based on birth and physical attributes are under my feet. What a great achievement! The Quranic revolution did not spare anything out from its reach", the Prophet (PBUH) said. How arrogant and haughty these Quresh were? It was سَقَرُ that burnt everything in its wake. These Arabs knew very well what this سَقَرُ meant? It means "to melt something as hard as a metal." How? لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ (74:29) – It disfigures to the extent that a person cannot be recognized anymore. Everything gets overturned. عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ (74:30) – This one is just one destruction. There are scores of others (this one and nineteen more). The question is: Who has brought these destructions? The Quran gives the answer (74:31):

وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً ۙ وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَيَزْدَادَ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا وَلَا يَرْتَابَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُونَ ۙ وَلِيَقُولَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْكَافِرُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۚ كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ ۗ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ ۚ وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْبَشَرِ

All these destructions are brought about by Our designated forces. As far as their number is concerned, this is mentioned just as a parable. People who do not believe

the Quran take these parables as reality, attach literal meanings to the eschatological descriptions, raise objections and become confused. But those who comprehend the Quran in depth can understand the real intent of these parables and their conviction would be further strengthened (3:7). Even the member of the believers (*Momineen*) whose knowledge is not so extensive will consolidate their faith. The fact of the matter is that such parables do not create any doubt or anxiety in the minds of people who have a deeper knowledge of the Quran, or those who are still in the initial stages of Iman. However, those who are perplexed or openly claim that the Quran is not divine writ, without hesitation raise objections about what Allah Almighty actually means by such parables (2:26). Accordingly, a person who develops a distorted vision and with his deeds adopts the wrong course, then in conformance with the law of requital he will never see the right path. However, the one who wants to go on the right course will receive guidance for it. The fact is that only Allah has the knowledge of how the divine forces work in the Universe and how these forces actively fulfill His destined program. These matters have been explained allegorically so that people can ponder over them; and so that the divine laws do not go out of their sight. (74:31)

My dear friends! The Quran's law of requital is real and it operates incessantly on every individual and on every nation. But these people believe that this law is not real and that the warning given about the oncoming revolution is only an empty threat. This is not so. The revolution is a reality which is bound to occur. Tell them to look at the discipline and order with which the entire system of the Universe functions according to the divine law. Then reflect: Is it difficult for the Almighty, whose limitless forces are doing such wondrous work, to bring about such a revolution? Just look at the moon? كَلَّا وَالْقَمَرِ (74:32) – Its appearance at the proper time and its passage through the various stages. Look at the alternation of day and night? وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ (74:33) – When the darkness of the night turns into the gleam of dawn. وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ (74:34) – And look at the appearance of morning with full brilliance. All these changes are living proof of the workings of the divine law of nature. We will continue with these verses further in the next lecture as something more in depth is coming next that will require detailed explanation.

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

☆.....☆.....☆